نہج البلاغہ کے پھول
محسنِ ملت کا چمن

استفادہ از کتب

محسنِ ملت حضرت رحمۃ اللہ علیہ
حجۃ الاسلام والمسلمین آیۃ اللہ الشیخ محسن علی نجفی

ترتیب

حسین علی ہاشمی (معلم جامعۃ الکوثر)

جامعۃ الکوثر، اسلام آباد

نہج البلاغہ کے پھول

محسنِ ملت کا چمن

استفادہ از کتب

محسنِ ملت، حجۃ الاسلام والمسلمین، حضرت آیۃ اللہ

الشیخ محسن علی نجفی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب:

حسین علی ہاشمی (متعلمِ جامعۃ الکوثر)

جامعۃ الکوثر، اسلام آباد

بیاد: محسنِ ملت، حجۃ الاسلام والمسلمین، حضرت آیۃ اللہ الشیخ **محسن علی نجفی** رحمۃ اللہ علیہ

عنوان: نہج البلاغہ کے پھول اور محسنِ ملت کا چمن

ترتیب: حسین علی ہاشمی (متعلمِ جامعۃ الکوثر)

ناشر: مرکز افکارِ اسلامی

تاریخ: ۱۸ فروری ۲۰۲۴

بمناسبت: چہلم محسنِ ملت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْعُلَمَآءُ بَاقُوْنَ مَا بَقِیَ الدَّهْر

"علماء رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں"۔[1]

امیرِ کلام، صاحبِ فصاحت و بیان علی بن ابی طالب علیہما السلام، قرآن مجید کے فرمان کے مطابق "راسخون فی العلم" اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے لحاظ سے "بابِ مدینۃ العلم" ہیں۔ خود مولاؑ "سلونی" کا دعویٰ کرتے ہوئے، اپنے سینۂ اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور حسرت سے فرماتے ہیں: "یہاں علم کا ذخیرہ موجود ہے، کاش! مجھے اس علم کا لینے والا کوئی مل جاتا"۔[2]

امامؑ کی اس حسرت کو ہر دور کے علماء پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اس بحرِ بیکرانِ علم سے موتی اخذ کر کے قوم و ملت میں تقسیم کرتے رہے۔ انہی علماء حقہ میں سے ایک عظیم شخصیت "محسنِ ملت" ہیں۔

محسنِ ملت حضرت علامہ الشیخ محسن علی نجفی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت وہ ماہر غوطہ زن ٹھہری کہ جنہوں نے فہم و فراست سے اپنی عقلِ سلیم کو اس قدر پاکیزہ کیا کہ علمِ حقیقی کے سفر میں امر ہو گئے۔ آپ کے قلم نے رخِ قرطاس پر علم کے ایسے نورانی ان مٹ نقوش چھوڑے کہ

اے خدا! تیری تجلی ہے کہ کچھ لوگ یہاں
موت کے بعد بھی صدیوں میں جیا کرتے ہیں

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت: ۱۴۷

[2] نہج البلاغہ، حکمت: ۱۴۷

آپ جیسی نابغہ روزگار شخصیت نے اپنی فکری پرواز کو ہمیشہ قرآن وسنت سے مستفاد جانا۔اسی لیے اپنی ساری زندگی قرآن وسنّت کی خدمت میں صرف کی چاہے وہ میدانِ علم ہو یا کارزارِ عمل۔آپ کی تصانیف،تحاریر اور تقاریر میں جہاں قرآن واحادیث کو منبع اولی کی حیثیت حاصل ہے وہیں نہج البلاغہ کے فصیح وبلیغ کلام کی رنگینیاں بھی بھرپور نظر آتی ہیں۔ اپنی دقیق اور علمی ابحاث میں نہج البلاغہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرتے ہوئے درِعلم "مولا علی علیہ السلام" سے خیراتِ علم پاتے ہیں۔اپنے استدلال کو نہج البلاغہ سے مستحکم اور ناقابلِ تردید بنانے کا ہنر کوئی آپ ہی سے سیکھے۔

زیرِ نظر مجموعۂ تحریر بھی آپ کی انہی علمی وفکری مہارتوں کا مجموعہ ہے۔ جہاں آپ کی تصنیفات وتحریرات کو نہج البلاغہ میں غوطہ زن ہوتے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔اس مجموعہ میں آپ کی من جملہ تصانیف میں سے ان خوبصورت نکات کی جمع وتدوین کی گئی ہے جہاں آپ نے نہج البلاغہ کے معجزانہ کلام سے بہترین استفادہ کیا۔کلامِ امام کے ذیل میں اپنی سطروں کو ایسے جوڑا جیسے درِعلم سے بابِ علم کے چشمے پھوٹ رہے ہوں۔خداوندمتعال مفسر قرآن حضرت الشیخ محسن علی نجفی رحمۃ اللہ علیہ کی ان مخلصانہ علمی خدمات کو ان کا صدقہ جاریہ قرار دیتے ہوئے تمام عالمِ اسلام کے لیے مفید قرار دے اور وارثِ علم لدنی مولائے کل علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی بارگاہ میں نایاب تحفہ قرار دے! آمین (ثم آمین)

الاحقر

حسین علی ہاشمی

متعلّم جامعۃ الکوثر

نہج البلاغہ در تفسیر الکوثر

ا۔ مقدمہ قرآن

وَ اللّٰهَ اللّٰهَ فِي الْقُرْاٰنِ، لَا يَسْبِقُكُمْ بِالْعَمَلِ بِهِ غَيْرُكُمْ۔

"قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ دوسرے
اس پر عمل کرنے میں تم پر سبقت لے جائیں"۔[1]

الکوثر فی تفسیر القرآن اور ترجمہ قرآن کے مقدمہ کا آغاز، محسنِ ملت نے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے مذکورہ بالا جملات سے کیا۔ آغازِ سخن سے پہلے نہج البلاغہ کا فرمان نقل کر کے گویا فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کیا کہ

عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ۔

"علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ۔"

الٰہیاتی تصور کائنات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبث خلق نہیں فرمایا بلکہ ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے پیدا کیا اور اس مقصد تک پہنچانے کے لیے انسان کو ارتقا و تکامل کے طویل مراحل سے گزارنا بھی سنت الٰہیہ رہی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ یوم میں خلق فرمایا اور چار یوم میں اس نے زمین کو انسان کے لیے قابل سکونت بنایا اور وسائل حیات پیدا کیے۔ ہر چند اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کو دفعتاً درجہ کمال تک پہنچا سکتا ہے لیکن حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ ہے کہ ارتقا و تکامل کا یہ عمل تدریجاً ہو۔ چنانچہ زمین کو چار مرحلوں میں

---

[1] نہج البلاغہ، وصیت: ۴۷

قابل سکونت بنایا گیا۔

جب تکامل و ارتقا کے مختلف مراحل سے گزر کر انسان کی مادی ترقی احسن تقویم کی منزل تک پہنچ گئی تو اگلے مرحلے میں وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا [۱] سے انسان کا فکری ارتقا شروع ہوا۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے ساتھ ہی اولاد آدم علیہ السلام کی تعلیم و تربیت کے لیے ابتدائی درسگاہ کھول دی گئی اور نظام حیات کی ابجد سے درس شروع ہو گیا۔

ان ادوار میں انسان ابھی عہد طفولیت میں تھا، لہٰذا اس کی تربیت و تعلیم کے لیے سمعی و بصری ذرائع سے کام لیا گیا اور انہیں ایسے معجزات دکھائے گئے جو محسوسات و مشاہدات سے متعلق تھے۔

جب انسان عقل و شعور کے لحاظ سے بلوغت کی منزل کو پہنچ گیا تو اسے محسوس معجزات کی جگہ معقول معجزہ (قرآن) دیا گیا کیونکہ انسان اس قابل ہو گیا تھا کہ اسے ایک جامع "ضابطۂ حیات" اور ایک ابدی "دستور زندگی" کا امین بنایا جائے۔ چنانچہ قرآن جیسا معجزہ عنایت فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امّت مرحومہ کو اس قابل بنایا کہ وہ اس سرمدی امانت کی حامل بن جائے۔ اس نعمت الٰہی کی معرفت اور اس کی قدردانی کی واحد صورت یہ ہے کہ کلام اللہ کو حتی الامکان سمجھا اور سمجھایا جائے۔ [۲]

۲۔ فضائل قرآن بزبانِ وصیؑ

الکوثر فی تفسیر القرآن کے مقدمہ میں قرآن کے فضائل بزبانِ قرآن و نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کرنے کے بعد، فضائلِ قرآن بزبانِ وصیؑ کے عنوان سے نہج البلاغہ کا کے بہترین و باکمال

---

[۱] بقرہ: ۳۱

[۲] مقدمہ قرآن، تفسیر الکوثر، ج ۱ ص ۹

خطبہ کا طویل حصہ درج فرمایا۔ جس میں قرآن مجید کے ۴۲ فضائل امامؑ نے بیان فرمائے۔
مولائے متقیان حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ نُوْرًا لَّا تُطْفَأُ مَصَابِيْحُهٗ. وَ سِرَاجًا لَّا يَخْبُوْ تَوَقُّدُهٗ. وَ بَحْرًا لَّا يُدْرَكُ قَعْرُهٗ. وَ مِنْهَاجًا لَّا يُضِلُّ نَهْجُهٗ. وَ شُعَاعًا لَّا يُظْلِمُ ضَوْؤُهٗ. وَ فُرْقَانًا لَّا يُخْمَدُ بُرْهَانُهٗ. وَ تِبْيَانًا لَّا تُهْدَمُ اَرْكَانُهٗ. وَ شِفَآءً لَّا تُخْشٰى اَسْقَامُهٗ. وَ عِزًّا لَّا تُهْزَمُ اَنْصَارُهٗ. وَ حَقًّا لَّا تُخْذَلُ اَعْوَانُهٗ۔

پھر آپؐ پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی جو (سراپا) نور ہے، جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں، ایسا چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی، ایسا دریا ہے جس کی تھاہ نہیں لگائی جا سکتی، ایسی شاہراہ ہے جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی، ایسی کرن ہے جس کی چھوٹ مدہم نہیں پڑتی، وہ ایسا (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والا ہے جس کی دلیل کمزور نہیں پڑتی، ایسا کھول کر بیان کرنیوالا ہے جس کے ستون منہدم نہیں کئے جا سکتے، وہ (سراسر) شفا ہے جس کے ہوتے ہوئے (روحانی) بیماریوں کا کھٹکا نہیں، وہ (سرتاسر) عزت و غلبہ ہے جس کے یار و مددگار شکست نہیں کھاتے، وہ (سراپا) حق ہے جس کے معین و معاون بے مدد چھوڑے نہیں جاتے۔

فَهُوَ مَعْدِنُ الْاِيْمَانِ وَ بُحْبُوْحَتُهٗ. وَ يَنَابِيْعُ الْعِلْمِ وَ بُحُوْرُهٗ. وَ رِيَاضُ الْعَدْلِ وَ غُدْرَانُهٗ. وَ اَثَافِيُّ الْاِسْلَامِ وَ بُنْيَانُهٗ. وَ اَوْدِيَةُ الْحَقِّ وَ غِيْطَانُهٗ. وَ بَحْرٌ لَّا يَنْزِفُهٗ

الْمُسْتَنْزِفُوْنَ. وَ عُيُوْنٌ لَّا يُنْضِبُهَا الْمَاتِحُوْنَ. وَ مَنَاهِلُ لَا يُغِيْضُهَا الْوَارِدُوْنَ. وَ مَنَازِلُ لَا يَضِلُّ نَهْجَهَا الْمُسَافِرُوْنَ. وَ اَعْلَامٌ لَّا يَعْمٰى عَنْهَا السَّآئِرُوْنَ. وَ اٰكَامٌ لَّا يَجُوْزُ عَنْهَا الْقَاصِدُوْنَ۔

وہ ایمان کا معدن اور مرکز ہے، اس سے علم کے چشمے پھوٹتے اور دریا بہتے ہیں، اس میں عدل کے چمن اور انصاف کے حوض ہیں، وہ اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے، حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے، وہ ایسا دریا ہے کہ جسے پانی بھرنے والے ختم نہیں کر سکتے، وہ ایسا چشمہ ہے کہ پانی الچنے والے اسے خشک نہیں کر سکتے، وہ ایسا گھاٹ ہے کہ اس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا، وہ ایسی منزل ہے کہ جس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں، وہ ایسا نشان ہے کہ چلنے والے کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا، وہ ایسا ٹیلہ ہے کہ حق کا قصد کرنے والے اس سے آگے گزر نہیں سکتے۔

جَعَلَهُ اللّٰهُ رِيًّا لِّعَطَشِ الْعُلَمَآءِ. وَ رَبِيْعًا لِّقُلُوْبِ الْفُقَهَآءِ. وَ مَحَاجَّ لِطُرُقِ الصُّلَحَآءِ. وَ دَوَآءً لَّيْسَ بَعْدَهٗ دَآءٌ. وَ نُوْرًا لَّيْسَ مَعَهٗ ظُلْمَةٌ. وَ حَبْلًا وَّثِيْقًا عُرْوَتُهٗ. وَ مَعْقِلًا مَّنِيْعًا ذِرْوَتُهٗ. وَ عِزًّا لِّمَنْ تَوَلَّاهُ. وَ سِلْمًا لِّمَنْ دَخَلَه. وَ هُدًى لِّمَنِ ائْتَمَّ بِهٖ. وَ عُذْرًا لِّمَنِ انْتَحَلَهٗ. وَ بُرْهَانًا لِّمَنْ تَكَلَّمَ بِهٖ. وَ شَاهِدًا لِّمَنْ خَاصَمَ بِهٖ. وَ فَلْجًا لِّمَنْ حَاجَّ بِهٖ. وَ حَامِلًا لِّمَنْ حَمَلَهٗ. وَ مَطِيَّةً لِّمَنْ اَعْمَلَهٗ. وَ اٰيَةً لِّمَنْ تَوَسَّمَ. وَ جُنَّةً لِّمَنِ اسْتَلْاَمَ. وَ عِلْمًا لِّمَنْ وَّعٰى.

وَ حَدِيْثًا لِّمَنْ رَوٰى، وَ حُكْمًا لِّمَنْ قَضٰى۔ [1]

اللہ نے اسے عالموں کی تشنگی کے لیے سیرابی، فقیہوں کے دلوں کے لیے بہار اور نیکوں کی رہ گزر کے لیے شاہراہ قرار دیا ہے۔ یہ ایسی دوا ہے کہ جس سے کوئی مرض نہیں رہتا، ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں، ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں، ایسی چوٹی ہے کہ جس کی پناہ گاہ محفوظ ہے۔ جو اس سے وابستہ ہو اس کے لیے سرمایۂ عزت ہے، جو اس کی حدود میں داخل ہو اس کے لیے پیغام صلح و امن ہے، جو اس کی پیروی کرے اس کے لیے ہدایت ہے، جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لیے حجت ہے، جو اس کی رُو سے بات کرے اس کے لیے دلیل و برہان ہے، جو اس کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کرے اس کے لیے گواہ ہے، جو اسے حجت بنا کر پیش کرے اس کے لیے فتح و کامرانی ہے، جو اس کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے، جو اسے اپنا دستور العمل بنائے اس کے لیے مرکب (تیز گام) ہے، یہ حقیقت شناس کے لیے ایک واضح نشان ہے، جو (ضلالت سے ٹکرانے کے لیے) سلاح بند ہو اس کے لیے سپر ہے، جو اس کی ہدایت کو گرہ میں باندھ لے اس کے لیے علم و دانش ہے، بیان کرنے والے کے لیے بہترین کلام اور فیصلہ کرنے والے کے لیے قطعی حکم ہے۔

اسی طرح ایک اور خطبہ میں ارشاد فرمایا:

فَتَجَلّٰى سُبْحَانَهٗ لَهُمْ فِیْ كِتَابِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّكُوْنُوْا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ: ۱۹٦

رَاَوْهُ، بِمَآ اَرَاهُمْ مِنْ قُدْرَتِهٖ۔۔۔[1]

اللہ ان کے سامنے بغیر اس کے کہ اسے دیکھا ہو قدرت کی (ان نشانیوں) کی وجہ سے جلوہ طراز ہے کہ جو اس نے اپنی کتاب میں دکھائی ہیں۔[2]

۳۔ فضائل قرآن در نہج البلاغہ

الکوثر فی تفسیر القرآن کے مقدمہ میں، اس عنوان کے تحت نہج البلاغہ سے گیارہ موتی ذکر فرمائے۔ نہج البلاغہ میں قرآن مجید کے فضائل اور اس کی قدر و معرفت کے بارے میں انمول خزانے موجود ہیں۔

ا۔ قرآن میں اللہ کی تجلی

۔۔۔فَتَجَلّٰی سُبْحَانَهٗ لَهُمْ فِیْ كِتَابِهٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّكُوْنُوْا رَاَوْهُ، بِمَآ اَرَاهُمْ مِنْ قُدْرَتِهٖ، وَ خَوَّفَهُمْ مِنْ سَطْوَتِهٖ۔[3]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اپنی کتاب (قرآن) میں جلوہ فرمایا تو لوگوں نے اسے دیکھا نہیں مگر قدرت کی ان نشانیوں کے ذریعے، جو اس نے اپنی کتاب میں دکھائیں۔۔۔

ب۔ مستقبل کے علوم

۔۔۔ اَلَا اِنَّ فِیْهِ عِلْمَ مَا یَاْتِیْ، وَ الْحَدِیْثَ عَنِ الْمَاضِیْ، وَ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ: ۱۴۵

[2] شیخ محسن علی نجفی، تفسیر الکوثر، ج ۱، ص ۱۷۔ ۲۳

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۵ ص ۳۸۷

دَوَآءَ دَآئِکُمْ، وَ نَظْمَ مَا بَیْنَکُمْ۔[۱]

اس (قرآن) میں آئندہ کی معلومات گزشتہ کے واقعات، تمہاری بیماریوں کا چارہ اور تمہارے باہمی تعلقات کی شیرازہ بندی ہے۔ (انتہائی قابل توجہ بات ہے کہ مستقبل کے لیے "علم" کا لفظ استعمال فرمایا اور ماضی کے لیے "واقعات" کا)۔

ج۔ جامع ضابطہ حیات

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّہٗ لَیْسَ عَلٰٓی اَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْاٰنِ مِنْ فَاقَۃٍ، وَ لَا لِاَحَدٍ قَبْلَ الْقُرْاٰنِ مِنْ غِنًی۔[۲]

جان لو کہ کسی کو قرآن کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج باقی نہیں رہتی اور نہ قرآن کے بغیر کسی کی احتیاج پوری ہو سکتی ہے۔

د۔ تعلیم قرآن

وَ تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّہٗ اَحْسَنُ الْحَدِیْثِ، وَ تَفَقَّھُوْا فِیْہِ فَاِنَّہٗ رَبِیْعُ الْقُلُوْبِ، وَ اسْتَشْفُوْا بِنُوْرِہٖ فَاِنَّہٗ شِفَآءُ الصُّدُوْرِ، وَ اَحْسِنُوْا تِلَاوَتَہٗ فَاِنَّہٗٓ اَنْفَعُ الْقَصَصِ۔[۳]

قرآن کا علم حاصل کرو کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور و فکر کرو یہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو کہ وہ سینوں میں چھپی ہوئی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور اس کی بہتر تلاوت کرو۔ اس کے واقعات سب واقعات سے زیادہ فائدہ مند ہیں۔

---

[۱] حوالہ سابق خطبہ ۱۵۶ ص ۴۱۵

[۲] حوالہ سابق خطبہ ۱۷۴ ص ۴۶۱

[۳] حوالہ سابق خطبہ ۱۰۸ ص ۳۸۹

ہ۔ شفاعت

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّہٗ شَافِعٌ مُّشَفَّعٌ، وَ قَآئِلٌ مُّصَدَّقٌ، وَ اَنَّہٗ مَنْ شَفَعَ لَہُ الْقُرْاٰنُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ شُفِّعَ فِیْہِ۔[۱]

جان لو کہ قرآن مقبول شفاعت اور تصدیق شدہ کلام کرنے والا ہے۔ قیامت کے روز جس کی قرآن شفاعت کرے گا وہ اس کے حق میں مانی جائے گی۔

و۔ زادِ آخرت

فَاِنَّہٗ یُنَادِیْ مُنَادٍ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ: اَلَا اِنَّ کُلَّ حَارِثٍ مُّبْتَلًی فِیْ حَرْثِہٖ وَ عَاقِبَۃِ عَمَلِہٖ غَیْرَ حَرَثَۃِ الْقُرْاٰنِ، فَکُوْنُوْا مِنْ حَرَثَتِہٖ وَ اَتْبَاعِہٖ۔[۲]

قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا: دیکھو ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں مبتلا ہے سوائے قرآن کی کھیتی بونے والوں کے۔ لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اس کے پیروکار بنو۔

ز۔ بے مانند نصیحت

وَ اِنَّ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ لَمْ یَعِظْ اَحَدًا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ، فَاِنَّہٗ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ، وَ سَبَبُہُ الْاَمِیْنُ، وَ فِیْہِ رَبِیْعُ الْقَلْبِ، وَیَنَابِیْعُ الْعِلْمِ، وَ مَا لِلْقَلْبِ جِلَآءٌ غَیْرُہٗ۔[۳]

---

[۱] حوالہ سابق خطبہ ۱۷۴ ص ۴۶۱

[۲] حوالہ سابق ص ۴۶۲

[۳] حوالہ سابق ص ۴۶۴

اللہ سبحانہ نے کسی کو ایسی نصیحت نہیں فرمائی جو اس قرآن کی مانند ہو۔
کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی اور مطمئن وسیلہ ہے اور اس میں دلوں کی
بہار اور علوم کے چشمے ہیں اور صرف اس سے قلب کی جلا ہوتی ہے۔

ک۔عہد و پیمان قرآن

وَ لَنْ تَأْخُذُوْا بِمِيْثَاقِ الْكِتَابِ حَتّٰى تَعْرِفُوا الَّذِىْ نَقَضَهٗ۔۔۔ فَالْتَمِسُوْا ذٰلِكَ مِنْ عِنْدِ اَهْلِهٖ۔[1]

تم قرآن کے عہد و پیمان کے ہرگز پابندہ نہ رہ سکو گے جب تک اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو۔ جو ہدایت والے ہیں انہی سے ہدایت طلب کرو۔

ل۔عمل بالقرآن میں اغیار کی سبقت

اللهَ اللهَ فِي الْقُرْاٰنِ، لَايَسْبِقُكُمْ بِالْعَمَلِ بِهٖ غَيْرُكُمْ۔[2]

قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کہیں دوسرے لوگ اس پر عمل کرنے میں تم پر سبقت نہ لے جائیں۔

م۔ذریعۂ نجات

وَ عَلَيْكُمْ بِكِتَابِ اللهِ، فَاِنَّهُ الْحَبْلُ الْمَتِيْنُ، وَ النُّوْرُ الْمُبِيْنُ، وَ الشِّفَآءُ النَّافِعُ، وَ الرِّيُّ النَّاقِعُ، وَ الْعِصْمَةُ لِلْمُتَمَسِّكِ، وَ النَّجَاةُ لِلْمُتَعَلِّقِ۔[3]

تم کتاب خدا پر عمل کرو۔ وہ ایک مضبوط رسی، روشن نور، نفع بخش شفا،

---

[1] حوالہ سابق خطبہ ۱۴۵ ص ۳۹۸

[2] حوالہ سابق، وصیت ۴۷ ص ۸ ۴۳

[3] حوالہ سابق خطبہ ۱۵۴ ص ۴۰۹۔ حال اہل القبور فی القیامۃ

پیاس بجھانے والی سیرابی ہے۔تمسک کرنے والے کے لیے سامان حفاظت اور وابستہ رہنے والے کے لیے نجات ہے۔

ن۔قرآن اور اہل قرآن کے ساتھ سلوک

یاتی علی الناس زمان لا یبقی فیھم من القران الا رسمه۔[1]

لوگوں پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جب ان میں قرآن کے صرف نقوش باقی رہ جائیں گے۔

وَ لَيْسَ عِنْدَ اَهْلِ ذٰلِكَ الزَّمَانِ سِلْعَةٌ اَبْوَرَ مِنَ الْكِتَابِ اِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ، وَ لَآ اَنْفَقَ مِنْهُ اِذَا حُرِّفَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔۔۔ فَالْكِتَابُ يَوْمَئِذٍ وَّ اَهْلُهٗ مَنْفِيَّانِ طَرِيْدَانِ، وَ صَاحِبَانِ مُصْطَحِبَانِ فِيْ طَرِيْقٍ وَّاحِدٍ لَّا يُؤْوِيْهِمَا مُؤْوٍ۔

اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جب اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ قیمتی چیز نہیں ہوگی جب کہ اس کی آیتوں کی تحریف کی جائے۔قرآن اور قرآن والے اس وقت راندہ ہوں گے۔ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے، انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا۔

فَالْكِتَابُ وَ اَهْلُهٗ فِيْ ذٰلِكَ الزَّمَانِ فِي النَّاسِ وَ لَيْسَا

---

[1] حوالہ سابق۔کلمات قصار ۳۶۹ ص ۹۲۴

فِيهِمْ، وَ مَعَهُمْ وَ لَيْسَا مَعَهُمْ! لِاَنَّ الضَّلَالَةَ لَا تُوَافِقُ الْهُدٰى وَ اِنِ اجْتَمَعَا فَاجْتَمَعَ الْقَوْمُ عَلَى الْفُرْقَةِ وَ افْتَرَقُوْا عَنِ الْجَمَاعَةِ. كَاَنَّهُمْ اَئِمَّةُ الْكِتَابِ وَ لَيْسَ الْكِتَابُ اِمَامَهُمْ۔[1]

وہ بظاہر لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق۔ اس لیے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ یک جا ہوں۔ لوگوں نے تفرقہ پردازی پر اتفاق کیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا وہ قرآن کے پیشوا ہیں اور قرآن ان کا پیشوا نہیں۔

۴۔ دنیا کی حقیقت

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔[2]

اور دنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں اور اہل تقویٰ کے لیے دار آخرت ہی بہترین ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

اس آیہ مجیدہ کی تفسیر میں محسنِ ملت فرماتے ہیں:

جو حیات اخروی کے قائل نہیں ہیں، ان کی دنیا صرف لہو ولعب اور کھیل تماشا ہے۔ وہ صرف اسی دنیا کی زندگی کے لیے جی رہے ہیں، اس لیے اس زندگی کو کھیل اور لہو سے تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ لہو اس کام کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے باز رکھے۔ ورنہ مؤمن کی

---

[1] حوالہ سابق خطبہ ۱۴۵ ص ۳۳۸

[2] انعام۔ ۳۲

دنیاوی زندگی، آخرت کے لیے مزرعہ ہے اور جتنی فصل مقدس ہے، اتنی ہی کھیتی مقدس ہے۔

دنیا کو کھیل تماشا کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس زندگی کی اسلام کی نظر میں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی ابدی زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی کھیل تماشا ہے۔ دنیا کی زندگی اگر آخرت کی زندگی کے خلاف گزاری جاتی ہے تو اس کی مذمت ہے، ورنہ اس زندگی کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ الدُّنْیَا دَارُ صِدْقٍ لِمَنْ صَدَقَهَا
وَ دَارُ عَافِیَةٍ لِمَنْ فَهِمَ عَنْهَا
وَ دَارُ غِنًی لِمَنْ تَزَوَّدَ مِنْهَا
وَ دَارُ مَوْعِظَةٍ لِمَنِ اتَّعَظَ بِهَا
مَسْجِدُ اَحِبَّاءِ اللّٰهِ
وَ مُصَلَّی مَلَائِكَةِ اللّٰهِ
وَ مَهْبِطُ وَحْیِ اللّٰهِ
وَ مَتْجَرُ اَوْلِیَاءِ اللّٰهِ ۔۔۔[1]

یہ دنیا اسے سچ سمجھنے والوں کے لیے سچائی کا گھر ہے،
جو اس دنیا سے سمجھے اس کے لیے عافیت کا گھر ہے،
جو اس سے زادراہ حاصل کرے اس کے لیے دولت کدہ ہے،
جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لیے نصیحت کا گھر ہے،
اللہ کے دوستوں کی عبادت گاہ،

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۴۲، ص ۲۱۳

اللہ کے فرشتوں کی جائے نماز،

اللہ کی طرف سے وحی نازل ہونے کی بارگاہ،

اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔[۱]

۵۔ دنیا اور آخرت کی کھیتی

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ ۚ وَ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ۔[۲]

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواہاں ہو ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی کا خواہاں ہو ہم اسے دنیا میں سے (کچھ) دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالب دنیا سے کہا ہے کہ اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا لیکن طالب آخرت سے نہیں کہا کہ اسے دنیا میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ الْمَالَ وَ الْبَنِیْنَ حَرْثُ الدُّنْیَا وَ الْعَمَلَ الصَّالِحَ حَرْثُ الْاٰخِرَۃِ وَ قَدْ یَجْمَعُھُمَا اللّٰہُ تَعَالَی لِاَقْوَامٍ۔۔۔[۳]

بے شک مال اور اولاد دنیا کی کھیتی اور عمل صالح آخرت کی کشت زار ہے

---

[۱] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۳ صفحہ ۳۵

[۲] الشوریٰ۔۲۰

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳

اور بعض لوگوں کے لیے اللہ ان دونوں چیزوں کو یکجا کر دیتا ہے۔[۱]

۶۔طویل آرزوئیں اور امیدیں

ذَرْہُمْ یَاْکُلُوْا وَ یَتَمَتَّعُوْا وَ یُلْہِہِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ۔[۲]

انہیں چھوڑ دیجیے کہ وہ کھائیں اور مزے کریں اور (طویل) آرزوئیں انہیں غافل بنا دیں کہ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

ان کافروں پر حجت پوری ہوگئی ہے اور یہ قابل ہدایت نہیں ہیں۔ انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجیے۔ یہ دنیا کی لذتوں میں مگن رہیں۔ یہ کھانے پینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں مال و متاع، جاہ و سلطنت اور لمبی زندگی جیسی آرزوؤں نے انہیں غافل بنا دیا ہے۔ ان کافروں کی دو باتوں کا ذکر ہے: خواہشات میں مگن اور لمبی آرزوئیں، جو خدا فراموش قوموں کی خاصیتیں ہیں۔ جو فرد یا قوم ناز و نعمتوں میں مگن ہوتی ہے وہ خدا و آخرت سے غافل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم مسلم معاشروں کے خوشحال افراد اور مغربی اقوام میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ اثْنَتَانِ اتِّبَاعُ الْھَوٰی وَطُولُ الْاَمَلِ فَاَمَّا اتِّبَاعُ الْھَوٰی فَیَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَ اَمَّا طُولُ الْاَمَلِ فَیُنْسِی الْاٰخِرَۃَ۔۔۔[۳]

---

[۱] الکوثر فی تفسیر القران جلد ۸ صفحہ ۶۹

[۲] الحجر۔۳

[۳] نہج البلاغہ، ص ۸۳، خطبہ ۴۲

مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ۔خواہشوں کی پیروی وہ چیز ہے جو حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔[1]

۷۔خدا کے غضب کی آگ

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ[2]

اور جب سمندروں کو جوش میں لایا جائے گا۔

لغت اور قرآنی شواہد کے مطابق سُجِّرَ کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں۔اس کا مطلب واضح ہے کہ قیام قیامت کے وقت سمندر سے آگ بھڑکائی جائے گی۔چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک یہودی سے پوچھا:

تمہاری کتاب میں آگ کی جگہ کون سی ہے؟ اس نے کہا: سمندر۔آپؑ نے فرمایا: یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے۔ہماری کتاب میں بھی ہے:

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ۔[3]

نہج البلاغہ میں آیا ہے:

وَتَجُرُّنِیْٓ اِلٰی نَارٍ سَجَرَھَا جَبَّارُھَا لِغَضَبِہٖ۔۔۔[4]

اور تم مجھے اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو کہ جسے خدائے قہار نے

---

[1] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۴ صفحہ ۳۵۶

[2] التکویر۔۶

[3] نہج البلاغہ، ص ۸۳، خطبہ ۴۲

[4] نہج البلاغہ، ص ۸۳، خطبہ ۴۲

اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔[۱]

۸۔انتہائی اہم امور

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔[۲]

اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر ان کے بارے میں نزول قرآن کے وقت پوچھو گے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی (جو کچھ اب تک ہوا) اس سے اللہ نے درگزر فرمایا اور اللہ بڑا بخشنے والا، بردبار ہے۔

بعض لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فضول باتیں پوچھتے تھے جن کا تعلق ان کے دین سے تھا نہ دنیا سے، بلکہ اس کا جواب اگر دیا جائے تو وہ سوال کرنے والے کے حق میں بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن بنا بر مصلحت بعض احکام کو مقام عمل میں وسعت دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس کو بطور اجمال بیان کرتا ہے، کیونکہ اگر تفصیلات میں جائے تو دائرہ عمل تنگ ہو جاتا ہے۔ اس پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً قوم موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ اگر ان لوگوں نے سوالات کا ایک سلسلہ شروع نہ کیا ہوتا تو کسی بھی گائے کو ذبح کیا جاتا تعمیل ہو جاتی اور کوئی مشکل پیش نہ آتی لیکن ان کے پے در پے سوالوں نے ان کے لیے

---

[۱] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۱۰ صفحہ ۶۷

[۲] المائدہ۔۱۰۱

کام کس قدر مشکل کر دیا اور ان پر عمل کرنا مشکل ہونے کی وجہ سے یا فاسق ہو جاتے یا انکار کر کے کفر تک پہنچتے۔

اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ: ان چیزوں کو اگر تم پر ظاہر کر دیا جائے تو تمھیں بری لگیں گی۔ مثلاً تمہاری موت کس وقت آئے گی۔ تمہارا باپ وہ نہیں جس کی طرف تو منسوب ہے وغیرہ۔ اس صورت میں وہ اپنی بدنامی دیکھ کر رسولؐ کی تکذیب کریں گے اور نتیجہ کفر کا نکلے گا۔

وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ: اگر نزول قرآن کے وقت پوچھو تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ بعض مفسرین کے مطابق اس آیت کے معنی یہ ہیں: جن چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان چیزوں کے بارے میں اگر نزول قرآن کے وقت پوچھو تو وہ تم کو بتا دی جائیں گی کا یہ مطلب نہیں کہ نزول وحی کے وقت پوچھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں نہ پوچھو، پھر بھی اگر نزول قرآن کے وقت پوچھا گیا تو بتا دی جائیں گی۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا: اس جملے کا ایک معنی یہی ہے جو ترجمے میں اختیار کیا گیا۔ دوسرا معنی یہ بتایا گیا ہے: جن چیزوں سے درگذر اختیار کیا گیا ہے، ان کے بارے میں نہ پوچھو۔ اس صورت میں لَا تَسْـَٔلُوْا کے ساتھ مربوط ہے، جو بعید ہونے کی وجہ سے بعید ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ: چنانچہ سابقہ اقوام نے اس قسم کے سوالات کیے تو حقائق بیان ہونے پر وہ منکر ہو گئے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے اور امامیہ کتب میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ افْتَرَضَ عَلَيْكُمْ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا، وَ حَدَّ لَكُمْ حُدُوداً فَلَا تَعْتَدُوهَا وَ نَهَاكُمْ عَنْ اَشْيَاءَ

فَلَا تَنْتَهِكُوهَا وَ سَكَتَ لَكُمْ عَنْ اَشْيَاءَ وَ لَمْ يَدَعْهَا نِسْيَاناً فَلَا تَتَكَلَّفُوهَا ۔ [1]

اللہ نے تم پر کچھ چیزیں فرض کی ہیں، ان کو ضائع نہ کرو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول گیا ہو، ان میں مت الجھو۔

تعجب کا مقام یہ ہے کہ ہمارے معاشروں میں بالکل اس حدیث کے خلاف عمل ہوتا ہے۔ یہاں فرائض وحدود اور محرمات کے بارے میں تو لوگ سوال کرتے ہی نہیں، صرف ان چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں جن سے اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے۔ [2]

۹۔حق وباطل کی آمیزش

وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ [3]

اور حق کو باطل کے ساتھ خلط نہ کرو اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

اس آیہ مجیدہ میں اللہ کی طرف سے نازل شدہ برحق باتوں کو باطل اور جعلی نظریات سے مخلوط کرنے کی مذمت ہو رہی ہے۔ باطل کو حق کی شکل میں پیش کرنے کا یہ عمل نہایت خطرناک ہے۔روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اس ضمن میں فرماتے ہیں:

فَلَوْ اَنَّ الْبَاطِلَ خَلَصَ مِنْ مِزَاجِ الْحَقِّ لَمْ يَخْفَ عَلَى

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت:۱۰۵

[2] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۹۱

[3] بقرہ۔ ۴۲

الْمُرْتَادِيْنَ وَ لَوْ اَنَّ الْحَقَّ خَلَصَ مِنْ لَّبْسِ الْبَاطِلِ لَانْقَطَعَتْ عَنْهُ اَلْسُنُ الْمُعَانِدِيْنَ وَ لٰكِنْ يُؤْخَذُ مِنْ هٰذَا ضِغْثٌ وَّ مِنْ هذا ضِغْثٌ فَيُمْزَجَانِ فَهُنَالِكَ يَسْتَوْلِي الشَّيْطَانُ عَلَى اَوْلِيَائِهٖ۔[1]

اگر باطل حق کی آمیزش سے خالی ہوتا تو وہ حق کے متلاشیوں سے پوشیدہ نہ رہتا اور اگر حق باطل کے شائبے سے پاک ہو کر سامنے آتا تو عناد رکھنے والی زبانیں بند ہو جاتیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ ادھر سے لیا جاتا ہے اور کچھ ادھر سے اور دونوں کو مخلوط کر دیا جاتا ہے۔ پس اس موقع پر شیطان اپنے دوستوں پر چھا جاتا ہے۔[2]

۱۰۔حق و باطل کی پہچان

حق اور باطل دونوں بالکل جدا امر ہیں۔ لیکن انسان جب اپنی فطرتِ سلیم اور عقلِ سلیم پہ باقی نہ رہے اور بصیرت میں کمی آجائے تو انسان کے لیے حق اور باطل کو پہچاننا انتہائی مشکل امر ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے کہ حق کہاں ہے اور باطل کہاں۔ حق میں سے باطل کی آمیزش کو نکالنا اس کے لیے شاید ناممکن ہو جاتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے جب حق اور باطل کی آمیزش ہو جائے اور حق کو باطل سے جدا کرنا ہو تو طریقہ کار یہی ہے کہ حق پرستوں کو جانا جائے اور باطل پرستوں کی پہچان کی جائے۔ حق پرستوں سے انسان کو حق کا راستہ ملتا ہے اور باطل پرستوں کو جان لینے سے باطل واضح ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے مولا علی علیہ السلام اپنے ایک صحابی سے ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ: ۵۰

[2] الکوثر فی تفسیر القران جلد ۱ صفحہ ۲۸۵

يَا حَارِثُ! اِنَّكَ نَظَرْتَ تَحْتَكَ. وَ لَمْ تَنْظُرْ فَوْقَكَ فَحِرْتَ! اِنَّكَ لَمْ تَعْرِفِ الْحَقَّ فَتَعْرِفَ مَنْ اَتَاهُ. وَ لَمْ تَعْرِفِ الْبَاطِلَ فَتَعْرِفَ مَنْ اَتَاهُ۔[1]

اے حارث! تم نے نیچے کی طرف دیکھا، اوپر کی طرف نگاہ نہیں ڈالی، جس کے نتیجہ میں تم حیران و سرگردان ہو گئے ہو۔ تم حق ہی کو نہیں جانتے کہ حق والوں کو جانو اور باطل ہی کو نہیں پہچانتے کہ باطل کی راہ پر چلنے والوں کو پہچانو۔[2]

۱۱۔ حق گراں اور باطل ہلکا

حق و باطل کی بہترین تعریف پیش کرنے کے لیے سورہ رعد کی ۱۷ ویں آیت کو پیش کرنا زیادہ مناسب ہے جس میں خداوند عالم نے فرمایا ہے:

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَداً رَابِياً وَ مِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَ أَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ ۔[3]

اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیوں میں بقدر ظرف بہنے لگا اور سیلاب میں جوش کھا کر جھاگ آ گیا اور اس دھات سے بھی جھاگ

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت ۲۶۲

[2] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۳۹

[3] الرعد: ۱۷

پیدا ہو گیا جسے آگ پر زیور یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں۔اسی طرح پروردگار حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے کہ زیور یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں۔اسی طرح پروردگار حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے کہ جھاگ خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے اور خدا اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کے مطابق باطل کھوکھلا ہوتا ہے، اس میں زیادہ آواز ہوتی ہے اور نجاستوں سے آلودہ، بے فائدہ اور بے ثمر ہوتا ہے، اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں حق، ثمر بخش، پاک و پاکیزہ، خوبصورت اور حیات و آبادی کا گوہر ہوتا ہے، اس کی عمر بے حد طولانی ہوتی ہے۔ بے شک حق و باطل کی مذکورہ تعریف سے بہتر کوئی تعریف نہیں ہوسکتی۔

اسی حوالے سے مولا علیؑ کا ارشاد ملاحظہ ہو:

اِنَّ الْحَقَّ ثَقِیْلٌ مَّرِیْٓءٌ، وَاِنَّ الْبَاطِلَ خَفِیْفٌ وَّبِیْٓءٌ۔[1]
حق گراں، مگر خوشگوار ہوتا ہے اور باطل ہلکا، مگر وبا پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔[2]

۱۲۔حق گوئی سے کبھی مت گھبراؤ

سچ بولنا اعلیٰ انسانی صفت ہے اور اخلاق کی سب سے بڑی پہچان ہے۔لہٰذا انسان کو اپنی زندگی میں یہ اصول قائم رکھنا چاہیے کہ ہمیشہ حق گو رہے۔حق کا ساتھ دے، حق کی بات

---

[1] نہج البلاغہ۔حکمت۔۳۷۶

[2] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۵۶

کرے، حق کی بات کو سنے اور حق کی بات کے لیے اپنی زندگی کو قربان کردے۔ یہی وہ اعلی انسانی صفت ہے جو انسان کی عزت و وقار میں اضافہ کرتی ہے۔ اس حوالے سے مولا علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

وَ لَا تَظُنُّوْا بِیَ اسْتِثْقَالًا فِیْ حَقٍّ قِیْلَ لِیْ، وَ لَا الْتِمَاسَ اِعْظَامٍ لِّنَفْسِیْ. فَاِنَّهٗ مَنِ اسْتَثْقَلَ الْحَقَّ اَنْ یُّقَالَ لَهٗۤ اَوِ الْعَدْلَ اَنْ یُّعْرَضَ عَلَیْهِ، كَانَ الْعَمَلُ بِهِمَاۤ اَثْقَلَ عَلَیْه. فَلَا تَكُفُّوْا عَنْ مَّقَالَةٍۭ بِحَقٍّ، اَوْ مَشُوْرَةٍۭ بِعَدْلٍ۔۔۔[1]

میرے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ میرے سامنے کوئی حق بات کہی جائے گی تو مجھے گراں گزرے گی اور نہ یہ خیال کرو کہ میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے بڑھا چڑھا دو، کیونکہ جو اپنے سامنے حق کے کہے جانے اور عدل کے پیش کئے جانے کو بھی گراں سمجھتا ہو اُسے حق و انصاف پر عمل کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوگا۔ تم اپنے کو حق کی بات کہنے اور عدل کا مشورہ دینے سے نہ روکو۔[2]

۱۳۔ جہالت اور گمراہی

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔[3]

ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: ہم تو تمہیں صریح گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۱۴

[2] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۱۸

[3] اعراف۔ ۶۰

انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے ساتھ ہمیشہ اس قوم کا مراعات یافتہ طبقہ رکاوٹ بنتا رہا، کیونکہ الٰہی دعوت عدل وانصاف، برادری و برابری کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، جس سے یہ مراعات یافتہ طبقہ متاثر ہوتا ہے اور محروم طبقہ مستفیض ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کی دعوت کو غریب طبقہ میں پذیرائی ملی اور طاغوتی طاقتوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ اپنے رسم ورواج اور عادات کو حق اور اس کے خلاف ہر بات کو گمراہ سمجھنا جہالت کی نمایاں علامت ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان قابل توجہ ہے:

الناس اعداء ما جھلوا۔ [1]

لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جس کو وہ نہیں جانتے۔ [2]

۱۴۔ جاہل کی نشانی

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ۔ [3]

کہد یجیے: اے نادانو! کیا تم مجھے کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی بندگی کروں؟

غیر اللہ کی بندگی کرنا اور اس سے لو لگانا جہالت کا نتیجہ ہے کیونکہ جہالت کی وجہ سے واقع اور حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے۔ جب واقع کا علم نہیں ہوگا تو جاہل ظن وگمان اور اپنے واہمے کے ذریعے اس غیر حقیقی چیز کو حقیقت کا لباس پہنائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا تَرَى الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطاً اَوْ مُفَرِّطاً۔ [4]

---

[1] نہج البلاغہ حکمت: ۱۷۲

[2] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۳ صفحہ ۲۳۵

[3] الزمر۔ ۶۴

[4] نہج البلاغہ کلمات قصار ۷۰

جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد سے آگے بڑھا ہوا اور یا اس سے بہت پیچھے۔
لہٰذا جاہل زیادتی اور کوتاہی کے گرداب میں پھنس جاتا ہے۔[۱]

۱۵۔امر بمعروف ونہی از منکر اور معاشرہ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔[۲]

اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت اور بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

معاشرے میں انسانی واخلاقی اقدار کو زندہ رکھنا اور ان اقدار کا دفاع کرنا، ضمیر کو زندہ رکھنا اور اس میں احساس وشعور بیدار رکھنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل اور اسلامی معاشرے کو مختلف آلودگیوں سے پاک اور صاف رکھنے کے لیے امر بمعروف اور نہی از منکر ایک فلٹر ہے، جس سے یہ صحت مند معاشرہ ہمیشہ پاک اور صاف رہتا ہے۔

امر بمعروف ونہی از منکر جن علماء وصلحاء کی ذمہ داری ہوتی ہے، ان میں سے اکثر اس لیے اس فریضے پر عمل نہیں کرتے کہ انہیں لوگوں سے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ اگر میں حق بات کروں تو میرے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ یہ حضرات اگر مولائے متقیان

---

[۱] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۷ صفحہ ۴۴۰

[۲] آل عمران۔ ۱۰۴

حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان پر ایمان لائیں تو اس عظیم ذمہ داری سے سرخ روئی کے ساتھ سبکدوش ہوجائیں:

وَ اِنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّهْیَ عَنِ الْمُنْكَرِ لَا يُقَرِّبَانِ مِنْ اَجَلٍ، وَ لَا يَنْقُصَانِ مِنْ رِّزْقٍ، وَ اَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ كُلِّهٖ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ اِمَامٍ جَآئِرٍ۔ [1]

یہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے موت قبل از وقت آجائے، یا رزق معین میں کمی ہوجائے۔ اور ان سب سے بہتر وہ حق بات ہے جو کسی جابر حکمران کے سامنے کہی جائے۔ [2]

۱۶۔ تنبیہ بھی ایک نعمت

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ [3]

پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

قبل از وقت آگاہ رہنا کہ قیامت کے دن اللہ کی مملکت سے فرار ممکن نہیں، ایک تنبیہ ہے جو ایک نعمت ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ حَذَّرَكَ كَمَنْ بَشَّرَكَ۔ [4]

جو (برائیوں سے) خوف دلائے وہ تمہارے لیے مژدہ سنانے

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت: ۳۷۴

[2] الکوثر فی تفسیر القران جلد ۲ صفحہ ۱۳۴

[3] الرحمن۔ ۴۳

[4] نہج البلاغہ حکمت: ۵۹

والے کے مانند ہے۔[1]

۱۷۔ تنبیہ کرنے والا

وَ کَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا وَّ صَرَّفْنَا فِیْهِ مِنَ الْوَعِیْدِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ اَوْ یُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا۔[2]

اور اسی طرح ہم نے یہ قرآن عربی میں نازل کیا اور اس میں مختلف انداز میں تنبیہیں بیان کی ہیں کہ شاید وہ پرہیزگار بن جائیں یا (قرآن) ان کے لیے کوئی نصیحت وجود میں لائے۔

جس طرح گزشتہ مطالب صاف اور فیصلہ کن لفظوں میں بیان ہوئے ہیں اسی وضاحت کے ساتھ ہم نے قرآن کو نازل کیا اور اس کو عربی جیسی شیرین اور مؤثر زبان میں رکھا۔ اس قرآن میں تنبیہات کو مختلف عبارتوں اور متعدد تعبیروں میں بیان کیا تاکہ وہ آنے والی ہولناکیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ یعنی وہ ایمان کی پناہ میں آکر اپنے آپ کو جہنم کے ابدی عذاب سے بچائیں یا اس امید کے ساتھ قرآن نازل کیا ہے کہ ان مشرکین کے دلوں میں قبول نصیحت کے لیے آمادگی پیدا ہو جائے، شاید ان کے ضمیر بیدار ہو جائیں۔

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

مَنْ حَذَّرَکَ کَمَنْ بَشَّرَکَ۔[3]

جو کسی کو آنے والی ہولناکیوں سے بچنے کے لیے تنبیہ کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اسے بشارت دیتا ہے۔

---

[1] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۸ صفحہ ۴۹۰

[2] طہ۔ ۱۱۳

[3] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۵۹

اسلام اپنے معاشرے میں ایک نظام دعوت قائم کر کے بیدار، باشعور اور ہمہ وقت مستعد معاشرہ تشکیل دینے کا اہتمام کرتا ہے، جس میں کسی ظالم کو ظلم، کسی خونخوار کو استحصال اور کسی استعماری طاقت کو سازش کرنے کا موقع ہی میسر نہ آئے۔

وہ معاشرہ کبھی آسودہ حال نہیں ہوسکتا، جس میں ظالم کو ظلم سے روکنے کے لیے کوئی طاقت، جرائم کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک بند اور وحشیانہ خواہشات کو قابو کرنے کے لیے کوئی لگام نہ ہو۔

یہ ایک عظیم ذمہ داری اور ایک مشکل عمل ہے، کیونکہ اس کے لیے معاشرے کے مختلف عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ظالم کو عدل و انصاف پسند نہیں ہوتا، مجرم کو پاکیزگی نفس اچھی نہیں لگتی اور متکبر کو تواضع راس نہیں آتی۔ خواہشات اور مفادات کے ایک لشکر جرار سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْیَ عَنِ الْمُنْکَرِ لَا یُقَرِّبَانِ مِنْ اَجَلٍ وَ لَا یَنْقُصَانِ مِنْ رِزْقٍ۔ [1]

امر بمعروف و نہی از منکر نہ موت کو نزدیک کرتا ہے اور نہ روزی میں کمی لاتا ہے۔ [2]

۱۸۔ گالی اور سب وشتم

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۱۳۴۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار: ۳۷۴

[2] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۳۴

عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔[۱]

گالی مت دو ان کو جن کو یہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں مبادا وہ عداوت اور نادانی میں اللہ کو برا کہنے لگیں، اس طرح ہم نے ہر قوم کے لیے ان کے اپنے کردار کو دیدہ زیب بنایا ہے، پھر انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پس وہ انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

یہ اسلامی پیروکاروں کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ہے کہ جن بتوں یا جن افراد کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں ان کو سَب وشتم نہ کرو۔ کسی بھی شخص کے مقدسات کی توہین نہ کرو کیونکہ ہر شخص کو اپنا عقیدہ عزیز ہوتا ہے۔ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے، اس کی دل آزاری کرنے سے وہ بھی مقابلہ میں یہی عمل انجام دے گا اور اس سَب وشتم کرنے والے کے مقدسات کی توہین کرے گا۔

مؤمنین نے اگر مشرکین کے خداؤں کو دشنام دیا تو وہ جاہلی تعصب اور مقابلے میں آکر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے۔ لہٰذا اس آیت میں منع کیا گیا کہ اس عمل زشت کا سبب اور محرک نہ بنو۔

گالی اور دشنام خود اپنی جگہ ایک زشت عمل ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس عمل زشت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ برائت اور سَب وشتم ایک چیز ہے۔ پاک کردار لوگوں کا بدکرداروں کی بدکرداری سے بیزاری کا اظہار کرنا برائت ہے۔ جب کہ گالی دینا، جو گھٹیا لوگوں کا کام ہے، سَب ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ اِنَّهٗ سَيَاْمُرُكُمْ بِسَبِّيْ وَ الْبَرَآئَةِ مِنِّيْ. فَاَمَّا السَّبُّ

---

[۱] انعام۔۱۰۸

فَسُبُّوْنِیْ. فَاِنَّهٗ لِیْ زَكَاةٌ، وَ لَكُمْ نَجَاةٌ. وَ اَمَّا الْبَرَآئَةُ فَلَا تَتَبَرَّأُوْا مِنِّیْ. فَاِنِّیْ وُلِدْتُّ عَلَى الْفِطْرَةِ، وَ سَبَقْتُ اِلَى الْاِیْمَانِ وَ الْهِجْرَةِ۔[۱]

وہ تمہیں حکم دے گا مجھے برا کہو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ جہاں تک برا کہنے کا تعلق ہے، مجھے برا کہ لینا۔ اس لیے کہ یہ میرے لیے پاکیزگی کا سبب اور تمہارے لیے (دشمنوں سے) نجات پانے کا باعث ہے لیکن (دل سے) بیزاری اختیار نہ کرنا، اس لیے کہ میں (دین) فطرت پر پیدا ہوا ہوں اور ایمان و ہجرت میں سابق ہوں۔

نیز جب حضرت علی علیہ السلام کے لشکروں نے لشکر معاویہ پر سب وشتم کیا تو آپؑ نے فرمایا:

اِنِّیْ اَكْرَهُ لَكُمْ اَنْ تَكُوْنُوْا سَبَّابِیْنَ ۔[۲]

مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تم سَب وشتم کرنے والے بن جاؤ۔

لہٰذا ہر قوم کو اپنا نظریہ، اپنا مذہب اچھا لگے گا۔ اسی میں ان کی آزمائش ہے کہ کون اس کے باوجود حق و ناحق میں تمیز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کون بے دلیل ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے۔[۳]

۱۹۔ نالائق حکمران

فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۔[۴]

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۵۷

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ: ۲۰۴

[۳] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۳ صفحہ ۱۱۷

[۴] محمد۔۲۲

پھر اگر تم حکمران بن جاؤ تو تم سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو گے اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو گے۔

جب تمہارے ایمان کا یہ حال اور حکم عدولی کا یہ عالم ہے تو تم سے فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ اور قطع رحمی کے سوا کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

دوسری تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ تم کبھی برسر اقتدار آئے تو تم سے فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ اور قطع رحمی کے علاوہ کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ بعض نے تَوَلَّیْتُمْ کے معنی منہ پھیرنے اور بعض نے برسر اقتدار آنے کے کیے ہیں۔

تَوَلَّیْتُمْ: التولی ولایت وحکومت کے معنوں میں زیادہ قرین سیاق ہے چونکہ حکمرانوں سے فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ کا ارتکاب ہوا کرتا ہے اور اپنی کرسی واقتدار کے لیے قریبی ترین رشتہ داروں کا بھی خون کرتے ہیں۔

چنانچہ چشم جہاں نے دیکھ لیا جب حکومت بنی امیہ کے ہاتھ آئی تو انہوں نے نہ کسی چھوٹے پر رحم کیا، نہ بڑے پر، نہ صلہ رحمی کا خیال رکھا۔

مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

رَاَیْتُ الدَّھَرَ یَرْفَعُ کُلَّ وَغْدٍ وَ یَخْفَضُ کُلَّ ذِیْ شَیْمٍ شَرِیْفِهٖ۔[1]

میں نے دیکھا ہے کہ زمانہ ہر نالائق کو بلند کرتا اور ہر شریف صفت کو گراتا ہے۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ: ۲۰۴

[2] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۸ صفحہ ۲۶۳

۲۰۔ظالم اور مظلوم

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۔[1]

اگرتم نے نیکی کی تو اپنے لیے نیکی کی اور اگر تم نے برائی کی تو بھی اپنے حق میں کی پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا۔ (تو ہم نے ایسے دشمنوں کو مسلط کیا) وہ تمہارے چہرے بدنما کر دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں اس طرح داخل ہو جائیں جس طرح اس میں پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے اسے بالکل تباہ کر دیں۔

خطاب اگرچہ بنی اسرائیل سے ہے تاہم یہ ایک کلیہ ہے کہ نیکی کے مثبت اثرات سب سے پہلے نیکی کرنے والے پر مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح برائی کے منفی اثرات برائی کا ارتکاب کرنے والے پر مترتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ظالم پر ظلم کے اثرات مظلوم سے زیادہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ نہج البلاغہ حکمت ۲۴۱ میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

یوم المظلوم علی الظالم اشد من یوم الظالم علی المظلوم ۔۔۔۔

مظلوم کے خلاف ظالم کے دن سے، ظالم کے خلاف مظلوم کا دن

---

[1] الاسراء۔ ۷

بہت شدید ہوگا۔[۱]

۲۱۔مسئلہ وراثت اور فدک

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۔[۲]

اور سلیمان داؤد کے وارث بنے اور بولے: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی کی تعلیم دی گئی ہے اور ہمیں سب طرح کی چیزیں عنایت ہوئی ہیں، بے شک یہ تو ایک نمایاں فضل ہے۔

حضرت سلیمان، حضرت داؤد علیہما السلام کے وارث بنے۔ کس چیز کے وارث بنے؟

ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ مال وحکومت کے وارث بنے کیونکہ باپ کی وفات پر اس کا مال اولاد کی طرف منتقل ہوجاتا ہے لیکن علم ونبوت میں ایسا نہیں ہے کہ باپ کا انتقال ہوتے ہی باپ کا علم اولاد کی طرف منتقل ہوجائے۔ اسی طرح نبوت بھی ہے۔ چنانچہ باپ عالم ہوتا ہے، بیٹا جاہل۔ نبوت میں بھی ایسا ہے۔ باپ نبی ہیں، بیٹا نہیں۔

حتیٰ اگر باپ بیٹا دونوں نبی ہیں تو بھی بیٹے کی نبوت اللہ کی طرف سے ہے، باپ کی طرف سے نہیں۔ البتہ باپ کے بعد مسند نبوت پر فائز ہونے کی صورت میں مجازاً وارث کہتے ہیں۔

لہٰذا یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ میراث کا اطلاق مال پر حقیقتاً ہوتا ہے، علم ونبوت پر

---

[۱] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۴ صفحہ ۴۹۲

[۲] النمل۔۱۶

مجازاً۔ جیسے اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ ۔[1] علماء انبیاء کے وارث ہیں، میں علماء کو وارث کہا ہے۔

آیت میں وَ وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ اطلاق ہے جو مالی وراثت پر حقیقتاً صادق آتا ہے۔ البتہ مال کے علاوہ علم ونبوت اس میں شامل ہونے پر دلیل کی ضرورت ہے۔

یہ آیہ مجیدہ من جملہ ان آیات میں سے ہے جن کے ذریعہ بی بی سیدہ سلام اللہ علیہا نے اپنے حق فدک پر احتجاج کیا ہے۔ یہ احتجاج فقط فدک کے لیے نہ تھا بلکہ در حقیقت تحفظ ولایت کے لیے تھا۔ اس جگہ ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی شرح میں حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان بلی کانت فی ایدینا فدک کے ذیل میں لکھا ہے:

میں نے علی بن الفارقی، جو المدرسۃ الغربیۃ بغداد کے مدرس تھے، سے پوچھا: کیا فاطمہ سچی تھیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: پھر حضرت ابوبکر نے فدک ان کو کیوں نہیں دیا؟ مسکرا کر کہا: اگر آج فدک دے دیتے تو کل فاطمہ اپنے شوہر کی خلافت کا بھی دعویٰ کرتیں تو ابوبکر کو اپنے مقام سے ہٹا دیتیں۔

اس ضمن میں مولا متقیانؑ کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

بَلٰی كَانَتْ فِیْۤ اَیْدِیْنَا فَدَكٌ مِنْ كُلِّ مَاۤ اَظَلَّتْهُ السَّمَآءُ. فَشَحَّتْ عَلَیْهَا نُفُوْسُ قَوْمٍ، وَ سَخَتْ عَنْهَا نُفُوْسُ اٰخَرِیْنَ، وَ نِعْمَ الْحَكَمُ اللّٰهُ. وَ مَاۤ اَصْنَعُ بِفَدَكٍ وَّ غَیْرِ فَدَكٍ، وَ النَّفْسُ مَظَانُّهَا فِیْ غَدٍ جَدَثٌ، تَنْقَطِعُ فِیْ ظُلْمَتِهٖ اٰثَارُهَا، وَ تَغِیْبُ اَخْبَارُهَا، وَ حُفْرَةٌ لَّوْ زِیْدَ فِیْ فُسْحَتِهَا وَ اَوْسَعَتْ یَدَا حَافِرِهَا، لَاَضْغَطَهَا الْحَجَرُ وَ الْمَدَرُ، وَ سَدَّ

---

[1] الکافی ۱: ۳۲

فَرَجَهَا التُّرَابُ الْمُتَرَاكِمُ۔ [1]

بے شک اس آسمان کے سایہ تلے لے دے کر ایک فدک [ا] ہمارے ہاتھوں میں تھا، اس پر بھی کچھ لوگوں کے منہ سے رال ٹپکی اور دوسرے فریق نے اس کے جانے کی پروانہ کی اور بہترین فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔ بھلا میں فدک یا فدک کے علاوہ کسی اور چیز کو لے کر کروں ہی گا کیا؟ جبکہ نفس کی منزل کل قبر قرار پانے والی ہے کہ جس کی اندھیاریوں میں اس کے نشانات مٹ جائیں گے اور اس کی خبریں ناپید ہو جائیں گی۔ وہ تو ایک ایسا گڑھا ہے کہ اگر اس کا پھیلاؤ بڑھا بھی دیا جائے اور گورکن کے ہاتھ اسے کشادہ بھی رکھیں، جب بھی پتھر اور کنکر اس کو تنگ کر دیں گے اور مسلسل مٹی کے ڈالے جانے سے اس کی دراڑیں بند ہو جائیں گی۔ [2]

۲۲۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست کون

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ [3]

اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمہارے کردار سے بیزار ہوں۔

ان قریبی رشتے داروں میں سے جو لوگ مؤمن ہیں اور آپؐ کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے لیے مہر و محبت اور تواضع کریں اور جو لوگ آپؐ کی دعوت کی نافرمانی کرتے ہیں اور

---

[1] نہج البلاغہ۔ مکتوب۔ ۴۵

[2] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۶ صفحہ ۱۴۶

[3] الشعراء۔ ۲۱۶

ابولہب کی طرح اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں تو ان سے بیزاری کا اظہار کیجیے۔

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ وَلِیَّ مُحَمَّدٍ مَنْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَ اِنْ بَعُدَتْ لُحْمَتُہٗ وَ اِنَّ عَدُوَّ مُحَمَّدٍ مَنْ عَصَی اللّٰہَ وَاِنْ قَرُبَتْ قَرَابَتُہٗ۔[1]

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کرے اگرچہ ان سے کوئی قرابت نہ ہو اور ان کا دشمن وہ ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے اگرچہ قریبی نزدیکی قرابت رکھتا ہو۔[2]

۲۳۔ وحی کو سننا

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ۔[3]

اور آپ کو یہ امید نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جائے گی مگر آپ کے رب کی رحمت سے لہٰذا آپ کافروں کے پشت پناہ ہرگز نہ بنیں۔

رسالت ایسا منصب نہیں ہے جو اس کی توقع رکھنے والوں کو مل جائے یہ مقام کسی بشر کی سوچ سے بالاتر اور کسی انسان کے فکری افق سے وسیع تر ہے۔

اگر رحمت رب آپؐ کے شامل حال نہ ہوتی تو آپؐ بذات خود یہ امید تک نہیں کر سکتے تھے کہ یہ قرآن آپؐ پر نازل کیا جائے گا۔ ظاہر ہے اللہ کی رحمت سے ہٹ کر نہ نبوت مل سکتی ہے، نہ قرآن نازل ہو سکتا ہے۔ یہ رحمت آپؐ سے کبھی جدا نہ رہی، نہ ہی کوئی ایسا زمانہ آیا

---

[1] الوسائل الشیعۃ ۱۵: ۲۳۸۔ نہج البلاغہ حکمت: ۹۶

[2] الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۶ صفحہ ۱۲۶

[3] القصص۔ ۶۸

جس میں آپؐ ہوں اور یہ رحمت آپؐ کے ساتھ نہ ہو۔

تعجب ہے بعض اہل قلم نے اس بات کے اثبات کے لیے کئی صفحات لکھ ڈالے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے نبوت ملنے کی امید تک نہ تھی اور آپؐ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا بلکہ آپؐ وحی نازل ہونے کے بعد بھی شک میں رہے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ آپؐ نبوت پر فائز ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا اللہ نے ایسے شخص سے رابطہ فرمایا جسے اتنا بھی علم نہ تھا جتنا ایک دوسرے شخص ورقہ بن نوفل کو تھا۔

ہم نے یہ بات کئی بار لکھی ہے کہ وحی کا تعلق صرف ظاہری حواس سے نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام وحی اپنے پورے وجود کے ساتھ حاصل کرتے ہیں جس میں شک و تردید کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جس قدر انہیں اپنے وجود پر یقین ہوتا ہے اسی قدر یقین سے وحی وصول کرتے ہیں۔

چنانچہ انبیاء وحی کی آواز سنتے ہیں۔ وہ ان کانوں سے نہیں سنتے اسی لیے جو لوگ نزول وحی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالکل پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ آواز نہیں سنتے تھے اور نہ ہی فرشتۂ وحی کو دیکھ سکتے تھے۔

البتہ حضرت علی علیہ السلام کا ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں وہ بھی ایسی آوازوں کو سن سکتے تھے۔ خطبہ قاصعہ ۱۹۰ نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

> وَ لَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّیْطَانِ حِیْنَ نَزَلَ الْوَحْیُ عَلَیْهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔۔
>
> جب آپؐ پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی۔
>
> میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ! یہ آواز کیسی ہے ہے؟ آپؐ نے فرمایا:
>
> هٰذَا الشَّیْطٰنُ قَدْ اَیِسَ مِنْ عِبَادَتِهٖ. اِنَّكَ تَسْمَعُ مَآ

اَسۡمَعُ، وَ تَرٰی مَآ اَرٰی، اِلَّآ اَنَّکَ لَسۡتَ بِنَبِیٍّ، وَ لٰکِنَّکَ وَزِیۡرٌ، وَاِنَّکَ لَعَلٰی خَیۡرٍ۔[۱]

یہ شیطان ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہوگیا ہے۔ (اے علی) جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ (میرے) وزیر و جانشین ہو اور یقیناً بھلائی کی راہ پر ہو۔[۲]

۲۴۔ انسان کے محافظین فرشتے

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَ مِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ۔[۳]

ہر شخص کے آگے اور پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے پہرے دار (فرشتے) مقرر ہیں جو بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کو برے حال سے دوچار کرنے کا ارادہ کرلے تو اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہوتا ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ، ۱۹۰

۲۔ الکوثر فی تفسیر القرآن جلد ۶ صفحہ ۲۸۱

۳۔ الرعد۔ ۱۱

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی حفاظت کے لیے فرشتے مامور ہیں۔ فرشتہ ہائے شب اور فرشتہ ہائے روز یکے بعد دیگرے انسان کی حفاظت کے لیے آتے جاتے ہیں۔ نماز صبح کے موقع پر شب اور روز کے فرشتے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہ فرشتے انسان کو ان تمام آفات سے بچاتے ہیں جو ہمیشہ انسانی وجود و بقا کے لیے مہلک ہوتی ہیں۔ انسان کے وجود کے اندر موجود مہلک چیزوں سے بچانے والے بھی موجود ہیں اور بیرونی خطرات سے بچانے والے بھی۔ طبعی اور ناگہانی آفتوں سے بچانے والے ہر گونہ محافظ موجود ہیں کہ اگر انسان کو زخم لگ جاتا ہے تو اس ناگہانی آفت سے بچانے والے اس زخم کو مندمل کرتے ہیں۔

وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ۔[1]

لہٰذا ممکن ہے روز و شب کے محافظ فرشتوں کے ساتھ طبعی محافظین پر بھی مُعَقِّبٰتٌ صادق آئے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ: انسان کی محافظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے لیکن انسان کے اپنے اعمال و حرکات کے اثرات سے بچانے کا ذمہ نہیں لیا۔ اس میں تو اللہ از خود کسی قوم کا حال نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ مَعَ کُلِّ اَنۡسَانٍ مَلَکَیۡنِ یَحۡفَظَانِہٖ فَاِذَا جَآءَ الۡقَدَرُ خَلَّیَا بَیۡنَہٗ وَ بَیۡنَہٗ ۔۔۔[2]

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں

---

[1] ۸۲ انفطار: ۱۰۔ جب کہ تم پر نگران مقرر ہیں

[2] نہج البلاغہ حکمت: ۲۰۱

اور جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ اس کے اور موت کے درمیان
سے ہٹ جاتے ہیں۔[۱]

۲۵۔زمین پر میخیں

وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْھٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ۔[۲]

اور اس نے زمین میں پہاڑوں کو گاڑ دیا تا کہ زمین تمہیں لے کر ڈگمگا نہ جائے اور نہریں جاری کیں اور راستے بنائے تا کہ تم راہ پاتے رہو۔

قرآن مجید متعدد آیات میں اس نکتہ کو بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ پہاڑ کی تخلیق کا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے زمین میں اضطرابی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے قرآن مجید کا اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ زمین کے اندرونی طبقات میں موجود لاوا آتش فشانی کے ذریعے سطح زمین پر آتا ہے اور پہاڑ بن جاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو زیر زمین موجود لاوا اور آتشین مواد سے زمین ڈھلک جاتی اور ڈگمگانے لگتی۔

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

وَ وَتَّدَ بِالصُّخُورِ مَیَدَانَ اَرْضِهِ ۔۔۔[۳]

تھرتھراتی ہوئی زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑیں۔۔۔[۴]

---

[۱] الکوثر فی تفسیر القران جلد ۴ صفحہ ۲۷۵

[۲] النحل۔۱۵

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۱

[۴] الکوثر فی تفسیر القران جلد ۴ صفحہ ۴۰۷

۲۶۔توحید خدا

ہمارا عقیدہ توحید یہ ہے کہ خداوند متعال اپنی ذات، افعال، صفات، عبادت اور خلق کرنے میں یکتا ہے۔ خداوند متعال کی ذات اور صفات کا دو مختلف چیزیں ہونا یہ بات قابل تصور نہیں کیونکہ ذات کا صفات سے مختلف ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ گویا ذات تھی اور صفات نہیں تھیں اور پھر یہ صفات بعد میں اس ذات پر متصف ہوئیں۔ جس طرح کہ چار کا عدد ہمیشہ جفت ہوتا ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ چار ہو اور جفت نہ ہو۔ اسی طرح خداوند متعال کی ذات اور صفات بھی ایک ہیں۔ اس حوالے سے مولا علیؑ کا نہج البلاغہ میں موجود خطبہ، توحید کا بہترین تعارف ہے۔

مولاؑ فرماتے ہیں:

فَمَنْ وَّصَفَ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ. وَ مَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ. وَ مَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاَهٗ. وَ مَنْ جَزَّاَهٗ فَقَدْ جَهِلَهٗ. وَ مَنْ جَهِلَهٗ فَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ. وَ مَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ. وَ مَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ. وَ مَنْ قَالَ: «فِيْمَ؟» فَقَدْ ضَمَّنَهٗ. وَ مَنْ قَالَ: «عَلَامَ؟» فَقَدْ اَخْلٰى مِنْهُ۔[1]

لہٰذا جس نے ذاتِ الٰہی کے علاوہ صفات مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا اور جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی اور جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس کے لیے جز بنا ڈالا اور جو اس کے لیے اجزا کا قائل ہوا وہ اس سے بے خبر رہا

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ا

اور جو اس سے بے خبر رہا اس نے اسے قابلِ اشارہ سمجھ لیا اور جس نے اسے قابلِ اشارہ سمجھ لیا اس نے اس کی حد بندی کر دی اور جو اسے محدود سمجھا وہ اسے دوسری چیزوں ہی کی قطار میں لے آیا اور جس نے یہ کہا کہ ''وہ کس چیز میں ہے''؟ اس نے اسے کسی شے کے ضمن میں فرض کر لیا اور جس نے یہ کہا کہ ''وہ کس چیز پر ہے؟'' اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں۔

اسی طرح تعارف ذات احدیت کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

هُوَ اللهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ، اَحَقُّ وَ اَبْيَنُ مِمَّا تَرَى الْعُيُوْنُ، لَمْ تَبْلُغْهُ الْعُقُوْلُ بِتَحْدِيْدٍ فَيَكُوْنَ مُشَبَّهًا، وَلَمْ تَقَعْ عَلَيْهِ الْاَوْهَامُ بِتَقْدِيْرٍ فَيَكُوْنَ مُمَثَّلًا۔[1]

وہ اللہ اقتدار کا مالک ہے اور (سراپا) حق اور (حق کا) ظاہر کرنے والا ہے۔ وہ ان چیزوں سے بھی زیادہ (اپنے مقام پر) ثابت و آشکارا ہے کہ جنہیں آنکھیں دیکھتی ہیں۔ عقلیں اس کی حد بندی کر کے اس تک نہیں پہنچ سکتیں کہ وہ دوسروں سے مشابہ ہو جائے اور نہ وہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کسی چیز کے مانند ہو جائے۔[2]

۲۷۔ خدا کی ذات کی حقیقت

اس بارے ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح سے (تعطیل) یعنی خداوند عالم اور اسکی صفات کی شناخت و معرفت کا حاصل کر لینا صحیح نہیں ہے، اسی طرح سے تشبیہ کے عقیدہ کا

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۱۵۳

[2] دراسات عصریہ فی الالھیات، ص ۱۰۵

قائل ہونا بھی غلط اور شرک آلود ہے، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس ذات پاک کو بالکل نہیں پہنچان سکتے، اس کی معرفت حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، جیسا کہ اسے مخلوقات سے تشبیہ نہیں سکتے۔ ایک راہ افراط پر منتہی ہوئی ہے تو دوسری تفریط پر، اس نکتہ پر توجہ ہوئی چاہیے۔ مولا علیؑ نہج البلاغہ میں ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

لَمْ يُطْلِعِ الْعُقُوْلَ عَلٰى تَحْدِيْدِ صِفَتِهٖ، وَلَمْ يَحْجُبْهَا عَنْ وَّاجِبِ مَعْرِفَتِهٖ، فَهُوَ الَّذِىْ تَشْهَدُ لَهٗ اَعْلَامُ الْوُجُوْدِ، عَلٰى اِقْرَارِ قَلْبِ ذِى الْجُحُوْدِ. تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الْمُشَبِّهُوْنَ بِهٖ وَ الْجَاحِدُوْنَ لَهٗ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔[1]

اس نے عقلوں کو اپنی صفتوں کی حد و نہایت پر مطلع نہیں کیا اور ضروری مقدار میں معرفت حاصل کرنے کے لیے ان کے آگے پردے بھی حائل نہیں کئے۔ وہ ذات ایسی ہے کہ جس کے وجود کے نشانات اس طرح اس کی شہادت دیتے ہیں کہ (زبان سے) انکار کرنے والے کا دل بھی اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ ان لوگوں کی باتوں سے بہت بلند و برتر ہے جو مخلوقات سے اس کی تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔[2]

۲۸۔ صفات خدا

خداوند متعال کی صفات ثبوتیہ میں سے ایک صفت قدرت ہے جو کہ اس کا کمال ذاتی ہے۔ خدا قادر ھے یعنی جس کام کو انجام دینا چاھے انجام دیتا ھے کسی کام کے کرنے پر مجبور

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۴۹

[2] ایضا، ص: ۱۲۹

اور عاجز نھیں ھے اور نہ ھی اس کی قدرت کے لیے کوئی جگہ مخصوص ھے بلکہ اس کی قدرت حد بندی سے خالی ھر جگہ موجود ھے۔

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

اَلَّذِی ابۡتَدَعَ الۡخَلۡقَ عَلٰی غَیۡرِ مِثَالٍ امۡتَثَلَہٗ، وَ لَا مِقۡدَارٍ احۡتَذٰی عَلَیۡہِ، مِنۡ خَالِقٍ مَّعۡبُوۡدٍ کَانَ قَبۡلَہٗ، وَ اَرَانَا مِنۡ مَّلَکُوۡتِ قُدۡرَتِہٖ، وَ عَجَآئِبِ مَا نَطَقَتۡ بِہٖ اٰثَارُ حِکۡمَتِہٖ، وَ اعۡتِرَافِ الۡحَاجَةِ مِنَ الۡخَلۡقِ اِلٰی اَنۡ یُّقِیۡمَھَا بِمَسَاكِ قُوَّتِہٖ، مَا دَلَّنَا بِاضۡطِرَارِ قِیَامِ الۡحُجَّةِ لَہٗ عَلٰی مَعۡرِفَتِہٖ، وَ ظَھَرَتۡ فِی الۡبَدَآئِعِ الَّتِیۡ اَحۡدَثَھَآ اٰثَارُ صَنۡعَتِہٖ، وَ اَعۡلَامُ حِکۡمَتِہٖ، فَصَارَ کُلُّ مَا خَلَقَ حُجَّةً لَّہٗ وَ دَلِیۡلًا عَلَیۡہِ، وَ اِنۡ کَانَ خَلۡقًا صَامِتًا، فَحُجَّتُہٗ بِالتَّدۡبِیۡرِ نَاطِقَةٌ، وَ دَلَالَتُہٗ عَلَی الۡمُبۡدِعِ قَآئِمَةٌ۔[1]

وہ وہی ہے کہ جس نے مخلوقات کو ایجاد کیا بغیر اس کے کہ کوئی مثال اپنے سامنے رکھتا اور بغیر اس کے کہ اپنے سے پہلے کسی اور خالق و معبود کی بنائی ہوئی چیزوں کا چربہ اتارتا۔ اس نے اپنی قدرت کی بادشاہت اور ان عجیب چیزوں کے واسطہ سے کہ جن میں اس کی حکمت و دانائی کے آثار (منہ سے) بول رہے ہیں اور مخلوق کے اس اعتراف سے کہ وہ اپنے رکنے تھمنے میں اس کے سہارے کی محتاج ہے، ہمیں وہ چیزیں دکھائی ہیں کہ جنہوں نے قہراً دلیل قائم ہو جانے

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۸۹

کے دباؤ سے اس کی معرفت کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے اور اس کی پیدا کردہ عجیب وغریب چیزوں میں اس کی صنعت کے نقش ونگار اور حکمت کے آثار نمایاں اور واضح ہیں۔ چنانچہ ہر مخلوق اس کی ایک حجت اور ایک برہان بن گئی ہے۔ چاہے وہ خاموش مخلوق ہو، مگر اللہ کی تدبیر وکارسازی کی ایک بولتی ہوئی دلیل ہے اور ہستی صانع کی طرف اس کی راہنمائی ثابت وبرقرار ہے۔[1]

۲۹۔ خدا کو دیکھنا

ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند متعال کی رویت (ظاہری آنکھوں) سے ممکن نہیں۔ بلکہ یہ سوال بھی محض ایک جہالت ہے کی کیا خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے مولا علیؑ کے دلچسپ جملے بہترین تشریح ہیں:

لَا تَرَاهُ الْعُيُوْنُ بِمُشَاهَدَةِ الْعِيَانِ، وَ لٰكِنْ تُدْرِكُهُ الْقُلُوْبُ بِحَقَآئِقِ الْاِيْمَانِ، قَرِيْبٌ مِّنَ الْاَشْيَآءِ غَيْرُ مُلَامِسٍ، بَعِيْدٌ مِّنْهَا غَيْرُ مُبَايِنٍ، مُتَكَلِّمٌ لَا بِرَوِيَّةٍ، مُرِيْدٌ لَا بِهِمَّةٍ، صَانِعٌ لَّا بِجَارِحَةٍ۔[2]

آنکھیں اسے کھلم کھلا نہیں دیکھتیں، بلکہ دل ایمانی حقیقتوں سے اسے پہچانتے ہیں۔ وہ ہر چیز سے قریب ہے، لیکن جسمانی اتصال کے طور پر نہیں، وہ ہر شے سے دور ہے، مگر الگ نہیں، وہ غور وفکر کئے بغیر کلام کرنے والا اور بغیر آمادگی کے قصد وارادہ کرنے والا اور بغیر اعضاء

---

[1] ایضاً، ص ۱۳۲

[2] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۱۷۷

(کی مدد) کے بنانے والا ہے۔[1]

۳۰۔ مسئلہ قضاء وقدر

کیا انسان مکمل طور پر ہر لحاظ سے فاعل مختار (اپنی مرضی سے جو چاہے کرسکتا ہے) یا پھر مجبور محض ہے (اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتا)؟

اس سلسلے میں ہمارا موقف " نہ جبر، نہ تفویض ہے۔ اشاعرہ جو اہل سنت کا ایک کلامی مذہب ہے کے نزدیک انسان فاعل فعل نہیں آلہ فعل ہے۔ معتزلہ جو اہل سنت کا دوسرا بڑا کلامی مذہب ہے، ارادہ انسان کو علت تامہ قرار دیتا ہے۔ کہتے ہیں اللہ نے یہ قدرت انسان کو تفویض کی ہے۔ اب اللہ روک بھی نہیں سکتا، انسان خود جو چاہے کرسکتا ہے۔

قرآن ان دونوں نظریوں کو مسترد کرتا ہے اور اپنے عمل کو "ہدایت" کا نام دیتا ہے۔ چنانچہ ہدایت وہاں ہوسکتی ہے جہاں انسان ترک فعل میں خود مختار ہو۔ جبر کی صورت میں ہدایت بے معنی ہے۔ ہدایت کا مطلب آزادی ہے۔ چنانچہ مجبور کو امر نہیں دیا جاسکتا، مجبور سے اطاعت نہیں ہوسکتی۔ جو شخص دریا میں غرق ہو رہا ہے اسے بچنے کا حکم دینا بے معنی ہے چونکہ وہ مجبور ہے اس حکم کی تعمیل نہیں ہوسکتی۔ جبر و تفویض والے، انسان کی قدرت اور اللہ کی قدرت کو باہم متضاد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جبر والوں نے انسان کی قدرت کی نفی کی ہے اور تفویض والوں نے اللہ کی قدرت کی نفی کی ہے۔ شیعہ امامیہ دونوں کی قدرت کے قائل ہیں۔ البتہ انسان کی قدرت اللہ کی قدرت کے مقابلے میں نہیں، بلکہ اس کے ذیل میں ہے۔ جبر کی صورت میں عقل کی ضرورت نہیں رہتی اور قانون و شریعت کی بھی۔

حیوانات اور دیوانوں کے لیے قانون کی ضرورت نہیں ہے۔ نظریہ جبر رکھنے والوں

---

[1] ایضاً، ص ۱۳۷

کے لیے بھی قانون کی ضرورت نہیں۔ مجبور انسان قانون پر عمل کیسے کرے گا؟ گاڑی اور ڈرائیور میں فرق ہے۔ گاڑی جبر کے تحت اور ڈرائیور عقل وارادے کے ساتھ ہے۔

اس موضوع پر بہترین راہنمائی مولائے متقیان علی علیہ السلام کے فرمان میں موجود ہے۔ جب ایک شامی نے امیر المومنین علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا ہمارا اہل شام سے لڑنے کے لیے جانا قضاء وقدر سے تھا؟ تو آپؑ نے ایک طویل جواب دیا جس کا ایک منتخب حصہ یہ ہے:

وَيْحَكَ! لَعَلَّكَ ظَنَنْتَ قَضَآءً لَّازِمًا، وَ قَدَرًا حَاتِمًا! وَ لَوْ كَانَ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ لَبَطَلَ الثَّوَابُ وَ الْعِقَابُ، وَ سَقَطَ الْوَعْدُ وَ الْوَعِيْدُ۔

خدا تم پر رحم کرے! شاید تم نے حتمی ولازمی قضاء وقدر سمجھ لیا ہے (کہ جس کے انجام دینے پر ہم مجبور ہیں)۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر نہ ثواب کا کوئی سوال پیدا ہوتا نہ عذاب کا، نہ وعدے کے کچھ معنی رہتے نہ وعید کے۔

اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ اَمَرَ عِبَادَهٗ تَخْيِيْرًا، وَ نَهَاهُمْ تَحْذِيْرًا، وَ كَلَّفَ يَسِيْرًا، وَ لَمْ يُكَلِّفْ عَسِيْرًا، وَ اَعْطٰى عَلَى الْقَلِيْلِ كَثِيْرًا، وَ لَمْ يُعْصَ مَغْلُوْبًا، وَ لَمْ يُطَعْ مُكْرِهًا، وَ لَمْ يُرْسِلِ الْاَنْبِيَآءَ لَعِبًا، وَ لَمْ يُنْزِلِ الْكُتُبَ لِلْعِبَادِ عَبَثًا، وَ لَا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا، ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ۔[1]

خداوند عالم نے تو بندوں کو خود مختار بنا کر مامور کیا ہے اور (عذاب

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۷۸

سے) ڈراتے ہوئے نہی کی ہے۔ اُس نے سہل و آسان تکلیف دی ہے اور دشواریوں سے بچائے رکھا ہے۔ وہ تھوڑے کئے پر زیادہ اجر دیتا ہے۔ اس کی نافرمانی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ دَب گیا ہے اور نہ اس کی اطاعت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے مجبور کر رکھا ہے۔ اس نے پیغمبروں کو بطور تفریح نہیں بھیجا اور بندوں کے لیے کتابیں بے فائدہ نہیں اتاری ہیں اور نہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان سب کو بیکار پیدا کیا ہے۔ ''یہ تو ان لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا تو افسوس ہے ان پر جنہوں نے کفر اختیار کیا، آتش جہنم کے عذاب سے''۔

اس روایت کا تتمہ یہ ہے کہ پھر اس شخص نے کہا کہ: وہ کونسی قضا و قدر تھی جس کی وجہ سے ہمیں جانا پڑا؟ آپؑ نے کہا کہ: ''قضا'' کے معنی حکم باری کے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ[1]

اور تمہارے پروردگار نے تو حکم دے دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرنا۔

یہاں پر ﴿قَضٰی﴾ بمعنی اَمَرَ ہے۔[2]

۳۱۔ انبیاء بھیجنے کا مقصد فطرت کی طرف ہدایت

انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کا تصور ہونے کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو پذیرائی ملی ہے اور انبیاء علیہم السلام سے تذکر آنے پر فطرت میں جنبش آجاتی۔ ہے۔ مٹی پر بارانی

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۲۳

[2] آئین بندگی، ص ۲۶

پانی پڑنے سے مردہ خاک جس طرح جنبش میں آتی اور زمین بیدار ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علی علیہ السلام کا انبیاء علیہم السلام کے مبعوث ہونے کے بارے فرمان ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس لیے مبعوث ہوئے:

لِیَسْتَأْدُوْهُمْ مِیْثَاقَ فِطْرَتِهٖ، وَیُذَکِّرُوْهُمْ مَنْسِیَّ نِعْمَتِهٖ۔[1]

تا کہ فطرت سے کیا ہوا عہد و میثاق پورا کرایا جائے اور اللہ کی فراموش نعتیں یاد دلائی جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دینداری انسان کی انسانیت سے مربوط ہے۔ یعنی جب سے انسان اس کرہ ارض پر وجود میں آیا ہے اپنے خالق کی طرف متوجہ رہا ہے۔ اس وقت جب انسان دلیل قائم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے ہم فطرت کو انسان میں ایک اور انسان کا ہونا کہہ سکتے ہیں۔ داخلی انسان کبھی بھی نافرمان نہیں ہوتا ہے۔ وہ حجت ہے اور حجت معصوم ہوتی ہے۔ یعنی جسے ہم عقل اور فطرت کہتے ہیں وہ داخلی انسان، حجت خدا ہے۔ جب کہ ظاہری انسان نافرمان ہوسکتا ہے۔ جب ظاہری و داخلی انسان ہم مزاج، ہم عقیدہ اور ہم آہنگ ہو جائیں تو ان میں اطمینان وسکون آجاتا ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔[2]

یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

قرآن کے مطابق انسان کا ابتدائی اور اصلی دین توحید ہے۔ شرک بعد میں پیدا ہوا۔ مغربی مصنفین پہلے یہ خیال کرتے تھے کہ انسان کا ابتدائی دین شرک تھا اور توحید تک بہت بعد میں پہنچا لیکن اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ انسان کا ابتدائی دین توحید تھا۔ اور یہی

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ:۱

[2] الرعد:۲۸

وہ بنیادی ہدایت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ابیاءؑ کو مبعوث فرمایا۔

حضرت علی علیہ السلام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بارے میں فرماتے ہیں:

فَبَعَثَ فِيهِمْ رُسُلَهُ، وَوَاتَرَ إِلَيْهِمْ أَنْبِيَاءَهُ، لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ ..... [1]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور اپنے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری رکھا تاکہ ان کو اپنی فطرت کے عہد و میثاق کی ادائیگی کی دعوت دیں۔

انسان نفسانی خواہشات، منفی تربیت و ماحول اور دیگر عوامل کی وجہ سے فطری تقاضوں سے منحرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً علم و احسان، دوستی سب کے نزدیک انسانی فطری تقاضوں میں شامل ہے، اس کے باوجود دیگر عوامل غالب آنے کی وجہ سے انسان، علم دوست ہوتا ہے اور نہ احسان پسند۔ البتہ انسان کو اگر علم و احسان کی دعوت دی جائے تو وہ فطرت کی آواز پہچان لیتا ہے۔

اگر انسان سے یہ عہد و میثاق نہ لیا گیا ہوتا تو انسان کے لیے معرفت حق ممکن نہ رہتی یا بالفاظ دیگر انسانی جبلت میں معرفت رب کی صلاحیت ودیعت نہ ہوئی ہوتی تو رب کی معرفت نہ ہوتی۔ لہذا، انبیاء علیہم السلام اس قدیم عہد و میثاق کو یاد دلانے کے لیے آئے ہیں۔ اگر یہ قدیم عہد و میثاق نہ ہوتا تو انبیاء علیہ السلام کی دعوت کو ہرگز پذیرائی نہ ملتی۔ یعنی اگر انسان کے وجود میں توحید کی طلب نہ ہوتی تو دعوت انبیاء علیہم السلام کی رسد کا کوئی خریدار نہ ہوتا۔ نقاش ازل نے نقش توحید لوح دل پر کندہ کر دیا تھا۔ اس لیے آج انبیاء علیہم السلام کے یاد دلانے پر انسان اس تحریر کو پڑھ لیتا ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت صدا بصحرا ثابت ہوتی۔ [2]

---

[1] نہج البلاغہ۔ ص ۴۳، خطبہ ۱

[2] انسان اور کائنات میں اللہ کی تجلی، ص ۱۲۔ ۱۵

معرفت نقش ہو گئی واقعہ بھول گئے
یعنی سبق یاد ہے، کلاس بھول گئے

۳۲۔حیوانات میں ان کی زندگی کے لوازمات اور سوجھ بوجھ ہونا قدرت الہیہ کی نشانی

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے۔ایک خطبے میں آپؑ فرماتے ہیں:

يَعْلَمُ عَجِيْجَ الْوُحُوْشِ فِي الْفَلَوَاتِ، وَ مَعَاصِيَ الْعِبَادِ فِي الْخَلَوَاتِ، وَ اخْتِلَافَ النِّيْنَانِ فِي الْبِحَارِ الْغَامِرَاتِ، وَ تَلَاطُمَ الْمَآءِ بِالرِّيَاحِ الْعَاصِفَاتِ۔[1]

وہ (خداوند عالم) بیابانوں میں چوپاؤں کے نالے (سنتا ہے)، تنہائیوں میں بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہے اور اتھاہ دریاؤں میں مچھلیوں کی آمد و شد اور تند ہواؤں کے ٹکراؤ سے پانی کے تھپیڑوں کو جانتا ہے اللہ مچھلیوں کی گہرے سمندروں میں آمدورفت کو جانتا ہے۔

حیوانات میں ان کی زندگی کے لوازمات، ہر قسم کا احساس اور سوجھ بوجھ موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض احساسات انسان سے بھی زیادہ ہیں۔[2]

۳۴۔بندگی

بندگی کے آداب میں سے ایک اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ بندہ اپنے) پروردگار کی عظمت اور اس کی بے شمار نعمتوں کے مقابلے میں اپنے عمل کو فقط، ناچیز سمجھے اور ہر ممکن

---

[1] نہج البلاغہ۔خطبہ ۱۹۸

[2] انسان اور کائنات میں اللہ کی تجلی، ۱۵۲۔۱۵۴

عبادت کرنے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں اپنی کوتاہی اور قصور کی معذرت چاہے کہ بندگی کا ادنی ترین حق بھی ادا نہ ہوا۔ بندہ خواہ کتنی عبادت کرے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کی عبادت کا حق ادا ہو جائے۔ کسی نبی مرسل اور کسی ملک مقرب نے یہ دعوی نہیں کیا کہ اس نے اللہ کی بندگی کا حق ادا کیا ہے۔

یہاں سے ہمیں انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام کا استغفار کرنا سمجھ میں آتا ہے کہ وہ معصوم ہونے کے باوجود مغفرت کیوں طلب کرتے تھے۔ ہمارا ذہن یہ کہتا ہے گناہ سرزد ہو تو مغفرت طلب کرے، نافرمانی ہو تو استغفار کرے۔ معصومین کی طرف اے سے طلب مغفرت ایسی نہیں ہے بلکہ اللہ کے خاص بندے جو معرفت حق سے سرشار اور عظمت الٰہی سے واقف ہیں اور اللہ کی ناقابل شمار نعمتوں کا بہتر احساس رکھتے ہیں، وہ اس بات پر استغفار کرتے ہیں کہ بندگی کا حق ادا نہ ہوا۔ یہاں سے معلوم ہوا عصمت اور استغفار میں کوئی منافات نہیں ہے۔

مولائے متقیان امیر المؤمنین علیہ السلام کی سیرت طیبہ میں ہمیں پوری وضاحت سے یہ بات مل جاتی ہے کہ بندگی کے آداب ولوازم کیا ہیں۔ ضرار الضبانی روایت کرتے ہیں:

میں نے امیر المؤمنین علیہ السلام کو اس وقت دیکھا جب رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ آپ محراب عبادت میں کھڑے اپنے ریش مبارک ہاتھ میں لیے ہوئے مار گزیدہ کی طرح کراہ رہے تھے اور فرما رہے تھے:

يَا دُنْيَا يَا دُنْيَا! اِلَيْكِ عَنِّىْ. اَ بِىْ تَعَرَّضْتِ؟ اَمْ اِلَىَّ تَشَوَّقْتِ؟ لَا حَانَ حِيْنُكِ! هَيْهَاتَ! غُرِّىْ غَيْرِىْ. لَا حَاجَةَ لِىْ فِيْكِ. قَدْ طَلَّقْتُكِ ثَلَاثًا لَّا رَجْعَةَ فِيْهَا! فَعَيْشُكِ قَصِيْرٌ. وَ خَطَرُكِ يَسِيْرٌ. وَ اَمَلُكِ حَقِيْرٌ. اٰهِ مِنْ

قِلَّةِ الزَّادِ، وَ طُوْلِ الطَّرِيْقِ، وَ بُعْدِ السَّفَرِ، وَ عَظِيْمِ الْمَوْرِدِ![1]

اے دنیا! اے دنیا دور ہو مجھ سے۔ کیا میرے سامنے اپنے کو لاتی ہے؟ یا میری دلدادہ و فریفتہ بن کر آئی ہے؟ تیرا وہ وقت نہ آئے (کہ تو مجھے فریب دے سکے)! بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ جا کسی اور کو جَل دے! مجھے تیری خواہش نہیں ہے۔ میں تو تین بار تجھے طلاق دے چکا ہوں کہ جس کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں۔ تیری زندگی تھوڑی، تیری اہمیت بہت ہی کم اور تیری آرزو ذلیل و پست ہے۔

افسوس! زادِ راہ تھوڑا، راستہ طویل، سفر دور و دراز اور منزل سخت ہے۔

وہ علی علیہ السلام جن کی ایک ضربت جن و انس کی عبادت سے بہتر ہے، فرما رہے ہیں: زاد راہ تھوڑا اور سفر طویل ہے۔[2]

۲۵۔ خوف صرف خدا کا

بندگی کا ایک نہایت اہمیت کا حامل عمل، تقویٰ ہے۔ تقوی، وقایہ سے ہے جو بچاؤ کے معنوں میں ہے۔ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عمل کو مضرات سے بچا کر صاف وشفاف کر کے بجالائے۔ عام طور پر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی عمل خیر کو کسی بھی طرح بجالانے سے ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے اور ثواب ملتا ہے۔ خواہ اسے بجالانے کا طریقہ کچھ بھی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ عمل وہ قبول ہوتا ہے جو بندگی کی منافی باتوں سے پاک ہو۔ ایک نیک

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۷۷

[2] آئین بندگی، ص ۷۲

عمل کی انجام دہی کے راستے میں اگر گناہ سرزد ہو جائے تو وہ عمل نیک نہیں رہے گا۔ مثلاً ایک مسجد کی تعمیر کے راستے میں کسی مؤمن کی غیبت یا اس کی اہانت ہو جائے تو مسجد بنانا نیکی نہیں رہے گی چونکہ مؤمن کی حرمت مسجد کی حرمت سے زیادہ ہے۔ مؤمن کی حرمت پامال کر کے مسجد بنانا تقویٰ کے بغیر عمل ہے جو قبول نہیں ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ بے شعوری میں کار ثواب کو کار عذاب میں بدل کر انجام دیتے ہیں۔ مسجدوں میں انجمنوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے اقامہ نماز جیسی نیکی برباد کر دیتے ہیں۔ عزاداری کے قیام کے بارے میں باہمی اختلافات کی وجہ سے جی بھر کر غیبت، بہتان اور الزام تراشیوں کے ذریعے مؤمن کی اہانت کرتے ہے ہیں۔ تنظیموں میں بھی اس قسم کی اہانتوں کی بہتات ہے اور یہ نہایت بدقسمتی ہے کہ اپنے حسنات میں اضافہ کر کے ضمیر اور وجدان کو معطر کرتے کرتے اسے گناہ کی کثافتوں سے بدبودار بنا ڈالتے ہیں۔

یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ تقوی سے انسان میں بصیرت آ جاتی ہے، جس سے انسان حق و باطل، خیر و شر، مفید و مضر چیزوں میں تمیز کر سکتا ہے جس سے اس کے دینی اور دنیوی مسائل کا حل آسان ہو جاتا ہے چونکہ متقی اپنی صائب نظری سے حقائق کی تہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی ایک ایسی طاقت عنایت فرمائی ہے جس سے انسان کی حقائق تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے لیکن تقوی نہ ہونے کی صورت میں اس کی عقل پر حرص و ہوس، مفاد پرستی اور منصب طلبی وغیرہ کا سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے اور اس غیر متقی شخص سے حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ تقوی اختیار کرنے کی صورت میں متقی کی صاف شفاف عقل اور بصیرت حقائق تک رسائی حاصل کر لیتی ہے۔ اس جگہ حضرت علی علیہ السلام کے خوبصورت جملات ہیں:

وَ لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرَضِیْنَ کَانَتَا عَلٰی عَبْدٍ رَتْقًا. ثُمَّ اتَّقَی اللّٰہَ. لَجَعَلَ اللّٰہُ لَہٗ مِنْھُمَا مَخْرَجًا! لَا یُؤْنِسَنَّکَ اِلَّا الْحَقُّ، وَ لَا یُوْحِشَنَّکَ اِلَّا الْبَاطِلُ. فَلَوْ قَبِلْتَ دُنْیَاھُمْ لَاَحَبُّوْکَ، وَ لَوْ قَرَضْتَ مِنْھَا لَاَمَّنُوْکَ۔[1]

اگر یہ آسمان و زمین کسی بندے پر بند پڑے ہوں اور وہ اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے زمین و آسمان کی راہیں کھول دے گا۔ تمہیں صرف حق سے دلچسپی ہونا چاہیے اور صرف باطل ہی سے گھبرانا چاہیے۔ اگر تم ان کی دنیا قبول کر لیتے تو وہ تمہیں چاہنے لگتے اور تم اس میں کوئی حصہ اپنے لیے مقرر کرا لیتے تو وہ تم سے مطمئن ہو جاتے۔

وَ مِنْ خُطْبَۃٍ لَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ: فَاِنَّ تَقْوَی اللّٰہِ مِفْتَاحُ سَدَادٍ، وَ ذَخِیْرَۃُ مَعَادٍ، وَ عِتْقٌ مِّنْ کُلِّ مَلَکَۃٍ، وَ نَجَاۃٌ مِّنْ کُلِّ ھَلَکَۃٍ، بِھَا یَنْجَحُ الطَّالِبُ، وَ یَنْجُوا الْھَارِبُ، وَ تُنَالُ الرَّغَآئِبُ۔[2]

بے شک اللہ کا خوف ہدایت کی کلید اور آخرت کا ذخیرہ ہے، (خواہشوں کی) ہر غلامی سے آزادی اور ہر تباہی سے رہائی کا باعث ہے، اس کے ذریعہ طلبگار منزلِ مقصود تک پہنچتا اور (سختیوں سے) بھاگنے والا نجات پاتا ہے اور مطلوبہ چیزوں تک پہنچ جاتا ہے۔

وَ اعْلَمُوْا عِبَادَ اللّٰہِ! اَنَّ الْمُتَّقِیْنَ ذَھَبُوْا بِعَاجِلِ الدُّنْیَا وَ اٰجِلِ الْاٰخِرَۃِ. فَشَارَکُوْٓا اَھْلَ الدُّنْیَا فِیْ دُنْیَاھُمْ، وَ لَمْ

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۱۲۸

[2] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۲۲۷

يُشَارِكُهُمْ اَهْلُ الدُّنْيَا فِيْ اٰخِرَتِهِمْ. سَكَنُوا الدُّنْيَا بِاَفْضَلِ مَا سُكِنَتْ. وَ اَكَلُوْهَا بِاَفْضَلِ مَآ اُكِلَتْ. فَحَظُوْا مِنَ الدُّنْيَا بِمَا حَظِيَ بِهِ الْمُتْرَفُوْنَ. وَاَخَذُوْا مِنْهَا مَآ اَخَذَهُ الْجَبَابِرَةُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ. ثُمَّ انْقَلَبُوْا عَنْهَا بِالزَّادِ الْمُبَلِّغِ. وَالْمَتْجَرِ الرَّابِحِ. اَصَابُوْا لَذَّةَ زُهْدِ الدُّنْيَا فِيْ دُنْيَاهُمْ. وَ تَيَقَّنُوْٓا اَنَّهُمْ جِيْرَانُ اللّٰهِ غَدًا فِيْٓ اٰخِرَتِهِمْ. لَا تُرَدُّ لَهُمْ دَعْوَةٌ، وَلَا يَنْقُصُ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنْ لَّذَّةٍ۔[1]

خدا کے بندو! تمہیں جاننا چاہیے کہ پرہیزگاروں نے جانے والی دنیا اور آنے والی آخرت دونوں کے فائدے اٹھائے۔ وہ دنیا والوں کے ساتھ ان کی دنیا میں شریک رہے، مگر دنیا داران کی آخرت میں حصہ نہ لے سکے۔ وہ دنیا میں بہترین طریقہ پر رہے اور اچھے سے اچھا کھایا اور اس طرح وہ ان تمام چیزوں سے بہرہ یاب ہوئے جو عیش پسند لوگوں کو حاصل تھیں اور وہ سب کچھ حاصل کیا کہ جو سرکش و متکبر لوگوں کو حاصل تھا۔ پھر وہ منزل مقصود پر پہنچانے والے زاد کا سروسامان اور نفع کا سودا کر کے دنیا سے روانہ ہوئے۔ انہوں نے دنیا میں رہتے ہوئے ترک دنیا کی لذت چکھی اور یہ یقین رکھا کہ وہ کل اللہ کے پڑوس میں ہوں گے، جہاں نہ ان کی کوئی آواز ٹھکرائی جائے گی، نہ ان کے حظ ونصیب میں کمی ہوگی۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ۔مکتوب۔۲۷

[2] آئین بندگی،ص ۱۶۶۔۱۷۰

۲۶۔خوف خدا اور امید

زندگی کے ارکان میں سے ایک اہم رکن یہ ہے کہ اللہ تعالی پر حسن ظن رکھا جائے۔ حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے اچھائی کی امید رکھی جائے کہ میں اللہ تعالی کا بندہ ہوں، اس کی مخلوق ہوں، وہی میرا مالک ہے، اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ بڑی مہربان ذات ہے۔وہ میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا۔

واضح رہے کہ اللہ تعالی پر حسن ظن رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کے احکام پر عمل نہ کیا جائے اور صرف حسن ظن رکھا جائے بلکہ حسن ظن کا مطلب یہ ہے اللہ کے احکام پر عمل کر کے اس کی قبولیت کے لیے حسن ظن رکھا جائے اور کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو معافی کا حسن ظن رکھا جائے گا۔

حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

وَ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ یَشۡتَدَّ خَوۡفُکُمۡ مِنَ اللّٰهِ، وَ اَنۡ یَّحۡسُنَ ظَنُّکُمۡ بِهٖ، فَاجۡمَعُوۡا بَیۡنَهُمَا، فَاِنَّ الۡعَبۡدَ اِنَّمَا یَکُوۡنُ حُسۡنُ ظَنِّهٖ بِرَبِّهٖ عَلٰی قَدۡرِ خَوۡفِهٖ مِنۡ رَّبِّهٖ، وَ اِنَّ اَحۡسَنَ النَّاسِ ظَنًّا بِاللّٰهِ اَشَدُّهُمۡ خَوۡفًا لِّلّٰهِ۔[1]

اگر یہ کرسکو کہ تم اللہ کا زیادہ سے زیادہ خوف بھی رکھو اور اس سے اچھی امید بھی وابستہ رکھو، تو ان دونوں باتوں کو اپنے اندر جمع کر لو، کیونکہ بندے کو اپنے پروردگار سے اتنی ہی امید بھی ہوتی ہے جتنا کہ اس کا ڈر ہوتا ہے۔اور جو سب سے زیادہ اللہ سے امید رکھتا ہے وہی سب

---

[1] نہج البلاغہ۔مکتوب۔۲۷

سے زیادہ اس سے خائف ہوتا ہے۔

واضح رہے حسن ظن، امید کا لازمہ ہے اور انسان جس چیز کی امید رکھتا ہے اس کے حصول کے لیے سعی کرتا ہے اور سعی کے بغیر امید رکھنے والے کو علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے احمق کہا ہے۔

لہذا، احادیث کی روشنی میں حسن ظن کا مورد یہ ہے کہ اطاعت کرنے کے بعد یہ توقع رکھے کہ اللہ اسے قبول فرمائے گا اور اس قلیل کے مقابلہ میں اجر عنایت فرمائے گا۔ میرے عمل میں اگر نقص ہے تو اس سے درگزر فرمائے گا۔[1]

۲۷۔ نفس کا محاسبہ

بندگی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ بندہ اپنے سے صادر ہونے والی روزانہ کی حرکات و اعمال سے غافل نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر بیدار، حواس، فعال اور عقل سالم ہوتی ہے۔ وہ اپنے سے سرزد ہونے والی ہر لغزش کو اپنی خامی شمار کرتا ہے اور کسی نیکی پر نہیں اتراتا۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ دوسروں کی کمزوریوں کا کھوج لگانے میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں، اپنی ذات سے غافل رہتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کے وجود تک کا احساس نہیں کرتے۔

جب کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق اپنی کمزوریوں پر گہری نظر رکھنی چاہیے اور دوسروں کی کمزوریوں سے درگزر کرنا چاہیے۔ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

فَحَاسِبْ نَفْسَكَ لِنَفْسِكَ. فَاِنَّ غَيْرَهَا مِنَ الْاَنْفُسِ لَهَا

---

[1] آئین بندگی، ص ۹۴

حَسِيبٌ غَيْرُكَ ۔[1]

تم اپنی بہبودی کے لیے اپنے ہی نفس کا محاسبہ کرو، کیونکہ دوسروں کا محاسبہ کرنے والا تمہارے علاوہ دوسرا ہے۔

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ رَبِحَ، وَ مَنْ غَفَلَ عَنْهَا خَسِرَ، وَ مَنْ خَافَ أَمِنَ، وَ مَنِ اعْتَبَرَ أَبْصَرَ، وَ مَنْ أَبْصَرَ فَهِمَ، وَ مَنْ فَهِمَ عَلِمَ ۔[2]

جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ فائدہ اٹھاتا ہے اور جو غفلت کرتا ہے وہ نقصان میں رہتا ہے۔ جو ڈرتا ہے وہ (عذاب سے) محفوظ ہو جاتا ہے اور جو عبرت حاصل کرتا ہے وہ بینا ہو جاتا ہے، اور جو بینا ہوتا ہے وہ بافہم ہو جاتا ہے، اور جو بافہم ہوتا ہے اسے علم حاصل ہو جاتا ہے۔[3]

ہم ایسی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں بہت حساب کیا جاتا ہے اور اس میں حساب کے بغیر زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔ جیسے زندگی کے مختلف مادی اور ظاہری حالات کے بارے میں حساب کیا جاتا ہے اسی طرح معنوی اور روحانی امور میں بھی اپنے نفس سے حساب لینا انتہائی ضروری اور اہم ہے۔ محاسبہ نفس، ایسا مفہوم ہے جو بہت گہرا اور دیگر سب دینی مفاہیم پر اثر انداز ہے، مگر لوگ اس سے بہت غافل ہیں۔ محاسبہ نفس ایسے نتائج اور فوائد کا حامل ہے کہ ان فوائد کو دیگر دینی تعلیمات سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں محاسبہ نفس پر بہت تاکید کی گئی ہے جس سے اس کی اہمیت بالکل واضح

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۲۱۹

[2] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۲۰۸

[3] آئین بندگی، ص ۱۰۳

ہو جاتی ہے۔

مولا علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ رَبِحَ، وَ مَنْ غَفَلَ عَنْهَا خَسِرَ، وَ مَنْ خَافَ اَمِنَ، وَ مَنِ اعْتَبَرَ اَبْصَرَ، وَ مَنْ اَبْصَرَ فَهِمَ، وَ مَنْ فَهِمَ عَلِمَ۔[1]

جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ فائدہ اٹھاتا ہے اور جو غفلت کرتا ہے وہ نقصان میں رہتا ہے۔ جو ڈرتا ہے وہ (عذاب سے) محفوظ ہو جاتا ہے اور جو عبرت حاصل کرتا ہے وہ بینا ہو جاتا ہے، اور جو بینا ہوتا ہے وہ بافہم ہو جاتا ہے، اور جو بافہم ہوتا ہے اسے علم حاصل ہو جاتا ہے۔[2]

۲۸۔ایمان وعمل

ایمان، اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول (ص) کی لائی ہوئی تعلیمات کی تصدیق کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جب ایمان وعقیدہ انسان کے دل میں راسخ ہو گا تو اس کا اثر اس کے ضمیر اور شعور میں نمایاں ہوگا اور اس کا لازمی نتیجہ اس کے اعمال کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ مثلاً اگر مریض کا ایمان ہو کہ فلاں دوائی میں میرا علاج ہے تو اس کے ایمان کا اثر اس کے شعور پر مرتب ہوگا جس کا نتیجہ اس کے عمل کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ کوئی عاقل ایسا نہ ہوگا جو اپنے اس ایمان کا اثر مرتب نہ ہونے دے اور اس یقین کے با

---

[1] نہج البلاغہ۔حکمت۔۲۰۸

[2] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب،ص ۸۳

وجود کہ دوائی استعمال نہ کرنے کی صورت میں مر جائے گا، علاج نہ کرائے۔ ایسا ایمان و عقیدہ جس کے آثار اس کے شعور اور عمل میں دکھائی نہ دیں، وہ ایمان نہیں بلکہ وہ حنوط شدہ لاش اور پلاسٹک کا پھول ہے جس میں نشو ونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں ہے اور جو بظاہر پھول دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت صرف نظر کا دھوکہ ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص اللہ تعالی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور پھر اللہ تعالیٰ و رسول کے احکام پر ایمان نہ لائے اور انہیں عملاً مسترد کر دے۔ یہ کس قدر غیر معقول تضادات ہیں۔

حقیقی ایمان انسان کو عمل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید ایمان کو عمل کے میزان میں تولتا ہے اور ستر سے زائد مقامات پر ایمان کو عمل کے ساتھ مربوط کر کے ذکر فرمایا ہے کہ دونوں لازم و ملزوم اور سبب و نتیجہ ہیں جو ایک۔ دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ایمان کے بغیر عمل وجود میں آسکتا ہے اور نہ ہی عمل کے بغیر ایمان کا ثبوت ملتا ہے۔

مولائے متقیان علیؑ فرماتے ہیں:

لَاَنْسُبَنَّ الْاِسْلَامَ نِسْبَةً لَّمْ يَنْسُبْهَا اَحَدٌ قَبْلِيْ: الْاِسْلَامُ هُوَ التَّسْلِيْمُ، وَ التَّسْلِيْمُ هُوَ الْيَقِيْنُ، وَ الْيَقِيْنُ هُوَ التَّصْدِيْقُ، وَ التَّصْدِيْقُ هُوَ الْاِقْرَارُ، وَ الْاِقْرَارُ هُوَ الْاَدَآءُ، وَ الْاَدَآءُ هُوَ الْعَمَلُ۔[1]

میں ''اسلام'' کی ایسی صحیح تعریف بیان کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نے بیان نہیں کی: ''اسلام'' سر تسلیم خم کرنا ہے، اور سر تسلیم جھکانا یقین ہے، اور یقین تصدیق ہے، اور تصدیق اعتراف ہے، اور اعتراف فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے۔[2]

---

[1] کلمات قصار۔ ۱۲۵

[2] فلسفہ نماز، ص ۲۰

۲۹۔ خلوص در عمل

ایک نظریاتی اور الٰہی شخص کے لیے یہ دنیا دار فانی اور محل امتحان ہے۔ یہاں عمل کے ذریعے امتحان لیا جاتا ہے۔ امتحان کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالی امتحان کے ذریعے اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تو پہلے ہی جانتا ہے کہ کون اچھا عمل کرے گا اور کون برا عمل کرے گا بلکہ امتحان کا مقصد انسانوں کو مستحق بنانا ہے کیونکہ بغیر عمل کے استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا انسان عمل کے ذریعے اعلیٰ درجات پر فائز ہوسکتا ہے اور عمل ہی کے ذریعے جانور سے بھی پست تر ہوسکتا ہے۔ لیکن اس عمل کی بنیاد خلوص پر ہے۔ بغیر خلوص عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مولا علیؑ کا یہ فرمان ملاحظہ ہو:

اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ، وَ کَمَالُ مَعْرِفَتِہِ التَّصْدِیْقُ بِہٖ، وَ کَمَالُ التَّصْدِیْقِ بِہٖ تَوْحِیْدُہٗ، وَ کَمَالُ تَوْحِیْدِہِ الْاِخْلَاصُ لَہٗ۔[1]

دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے کمال معرفت اس کی تصدیق ہے کمال تصدیق توحید ہے، کمال توحید تنزیہ واخلاص ہے۔[2]

۳۰۔ زُہد کی تعریف

امام علیؑ فرماتے ہیں:

اَلزُّھْدُ کُلُّہٗ بَیْنَ کَلِمَتَیْنِ مِنَ الْقُرْاٰنِ: قَالَ اللہُ سُبْحَانَہٗ:

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ا

[2] فلسفہ نماز، ص ۲۶

﴿لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾.
وَ مَنْ لَّمْ يَأْسَ عَلَى الْمَاضِيْ، وَ لَمْ يَفْرَحْ بِالْآتِيْ، فَقَدْ
اَخَذَ الزُّهْدَ بِطَرَفَيْهِ۔[۱]

زہد کی مکمل تعریف قرآن کے دو جملوں میں ہے: ارشادِ الٰہی ہے:
''جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اس پر رنج نہ کرو، اور جو چیز خدا تمہیں دے اس پر اتراؤ نہیں''۔ لہٰذا جو شخص جانے والی چیز پر افسوس نہیں کرتا اور آنے والی چیز پر اتراتا نہیں، اس نے زہد کو دونوں سمتوں سے سمیٹ لیا۔

بندگی کا ایک اہم ترین ستون یہ ہے کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہا جائے۔ کہ بندہ اللہ کی ملکیت میں ہے اور اللہ مالک حقیقی ہے۔ مملوک کو مالک کے فیصلوں پر راضی رہنا چاہیے۔ اگر یہ مالک خود بندے سے زیادہ اس پر مہربان ہو تو اس مہربان مالک کا فیصلہ سر اور آنکھوں پر رکھنا چاہیے۔

بندہ ایک نادان بچے کی طرح ہے جس کا مہربان باپ بچے کے حق میں فیصلے کرتا ہے۔ جس میں وقتی طور پر کچھ تکلیف ہے لیکن اس کے بہت اچھے اور دور رس نتائج ہیں۔ بچہ نادان ہونے کی وجہ سے اس فیصلے پر نالاں ہوتا ہے۔ اگر بچے کی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ مہرباں باپ اس کے حق میں فیصلے کرتا ہے تو وہ اس فیصلے کو کھلے دل سے قبول کر لیتا۔[۲]

لہٰذا اللہ ارحم الراحمین پر ایمان رکھنے والا اس کے ہر فیصلے پر راضی رہتا ہے۔ اس لیے ایمان کے لوازم میں سے درج ذیل امور ہیں:

---

[۱] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۴۳۹

[۲] آئین بندگی، ص ۱۱۲

۱۔ اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا

۲۔ اللہ پر توکل کرنا

۳۔ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرنا

۴۔ حکم خدا تسلیم کرنا

۳۱۔ عبادت کرنے والوں کی اقسام

نماز میں قربۃً الی الہ یعنی اللہ کی قربت حاصل کرنے کی نیت ہونا ضروری ہے۔ اور اس میں رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی اور غرض شامل نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی دکھاوے یا کا شہرت کے لیے نماز پڑھتا ہے تو حدیث کے مطابق روز قیامت اس سے کہا جائے گا کہ جس کے لیے تو نے نماز پڑھی اسی سے اس کا ثواب مانگ۔

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللہَ رَغْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ التُّجَّارِ، وَ اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللہَ رَهْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْعَبِيْدِ، وَ اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللہَ شُكْرًا فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْاَحْرَارِ۔[1]

ایک جماعت نے اللہ کی عبادت ثواب کی رغبت و خواہش کے پیشِ نظر کی، یہ سودا کرنے والوں کی عبادت ہے، اور ایک جماعت نے خوف کی وجہ سے اس کی عبادت کی، یہ غلاموں کی عبادت ہے، اور ایک جماعت نے از روئے شکر و سپاس گزاری اس کی عبادت کی، یہ آزادوں کی عبادت ہے۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت قصار۔ ۲۳۷

[2] فلسفہ نماز، ص ۱۰۶

۳۲۔نماز کی وصیت

نماز کی اہمیت، فضائل، آداب اور احکام کے بارے میں معصومین علیہم السلام سے بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔مولا علیؑ نے تو اس دنیا سے جاتے وقت بھی نماز کی وصیت فرمائی۔

روایت ہے:

الله الله في الصلوة فانها عمود دينكم ۔[۱]

اللہ اللہ نماز (کو نہ بھولو) کیونکہ یہ تمہارے دین کا ستون ہے۔[۲]

۳۳۔گناہ کو نا قابل اعتنا سمجھنا

یہ بات بندگی کے سراسر منافی ہے کہ اللہ کی نافرمانی کر کے اسے قابل اعتنا نہ سمجھے۔اس میں بندگی کے منافی دو باتیں ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے رب کی معصیت کی اور نافرمانی کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس نے اس نافرمانی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی نظر میں اپنے رب کے حکم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔یہ مقام رب کی اہانت ہے کہ بندہ یہ سمجھے کہ اگر اللہ کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو کیا حرج ہے۔یہ بے اعتنائی اپنی جگہ جرم ہے۔ یہ اس جرم کے علاوہ ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا ہے۔

آداب بندگی یہ ہیں کہ اپنی اطاعت کو قلیل یا ناچیز سمجھے اور قلیل گناہ کو بڑی گستاخی سمجھے۔یہ بات بندگی کے خلاف ہے کہ اپنی قلیل اطاعت پر اترائے اور کثیر گناہ کو اعتنا میں

---

[۱] نہج البلاغہ۔مکتوب ۴۷۔وصیت امام حسنؑ و امام حسین

[۲] فلسفہ نماز، ص ۲۸

نہ لائے۔ اس شخص کا بندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ کبھی دو رکعت نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو وحی کے انتظار میں بیٹھے اور زندگی بھر گناہ کر کے احساس گناہ تک نہ کرے۔

امام علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

اَشَدُّ الذُّنُوبِ مَا اسْتَهَانَ بِهٖ صَاحِبُهٗ۔[۱]

سب سے بھاری گناہ وہ ہے کہ جس کا ارتکاب کرنے والا اسے سبک سمجھے۔

چھوٹے گناہوں میں بے باکی و بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کے معاملہ میں بے پرواہ سا ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ عادت اسے بڑے بڑے گناہوں کی جرأت دلا دیتی ہے اور پھر وہ بغیر کسی جھجک کے ان کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا چھوٹے گناہوں کو بڑے گناہوں کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے ان سے احتراز کرنا چاہیے، تاکہ بڑے گناہوں کے مرتکب ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔[۲]

۳۴۔ محنت کا اسلامی تصور

اس ارض معمورہ کی آبادی اور موجودات زندہ کی حیات کا راز محنت میں مضمر ہے، محنت ہی سے چمن حیات میں زینت اور چہرہ فطرت میں بشاشت آتی ہے۔ خالق کائنات نے بھی کسی ایسے جاندار کو خلق نہیں فرمایا جو بلا محنت روزی حاصل کرتا ہو اس نے ہر زندہ مخلوق کو خلقت کے ساتھ محنت کرنے کا فطری محرک اس کے وجود میں ودیعت فرما دیا ہے۔ اسی فطری ہدایت اور الٰہی رہنمائی کے تحت ہر ذی حیات اپنی روزی تلاش کرنے کے لیے محنت

---

[۱] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۳۴۸

[۲] آئین بندگی، ص ۱۵۴

کرتا ہے اور ہر ذی روح اپنی ذات کے ساتھ محبت کرتا ہے اور اسی ذات کے تحت اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ زندگی روزی پر موقوف ہے اور روزی محنت پر موقوف ہے۔ اسی لیے ہر زندہ، زندگی کی خاطر محنت کرتا ہے۔ اس سے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات اور محنت لازم وملزوم ہیں۔

اسی چھوٹی سی مخلوق چیونٹی کو دیکھیے کہ اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے کس قدر جفاکشی سے کام لیتی ہے۔ اس کے بارے میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

أُنْظُرُوْا اِلَى النَّمْلَةِ فِیْ صِغَرِ جُثَّتِهَا، وَ لَطَافَةِ هَيْئَتِهَا، لَا تَكَادُ تُنَالُ بِلَحْظِ الْبَصَرِ، وَ لَا بِمُسْتَدْرَكِ الْفِكْرِ، كَيْفَ دَبَّتْ عَلٰى اَرْضِهَا، وَ صُبَّتْ عَلٰى رِزْقِهَا، تَنْقُلُ الْحَبَّةَ اِلٰى جُحْرِهَا، وَ تُعِدُّهَا فِیْ مُسْتَقَرِّهَا، تَجْمَعُ فِیْ حَرِّهَا لِبَرْدِهَا، وَ فِیْ وُرُوْدِهَا لِصَدَرِهَا، مَكْفُوْلَةٌ بِرِزْقِهَا، مَرْزُوْقَةٌ بِوِفْقِهَا، لَا يُغْفِلُهَا الْمَنَّانُ، وَ لَا يَحْرِمُهَا الدَّيَّانُ، وَلَوْ فِی الصَّفَا الْيَابِسِ، وَ الْحَجَرِ الْجَامِسِ![1]

ذرا اس چیونٹی کی طرف اس کی جسامت کے اختصار اور شکل وصورت کی باریکی کے عالم میں نظر کرو۔ اتنی چھوٹی کہ گوشۂ چشم سے بمشکل دیکھی جا سکے اور نہ فکروں میں سماتی ہے۔ دیکھو تو کیونکر زمین پر رینگتی پھرتی ہے اور اپنے رزق کی طرف لپکتی ہے اور دانے کو اپنے بل کی طرف لیے جاتی ہے اور اسے اپنے قیام گاہ میں مہیا رکھتی ہے اور گرمیوں میں جاڑے کے موسم کے لیے اور قوت وتوانائی کے زمانے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ: ۱۸۳

میں عجز و درماندگی کے دنوں کے لیے ذخیرہ اکٹھا کر لیتی ہے۔ اس کی روزی کا ذمہ لیا جا چکا ہے اور اس کے مناسب حال رزق اسے پہنچتا رہتا ہے۔ خدائے کریم اس سے تغافل نہیں برتتا اور صاحب عطا و جزا اسے محروم نہیں رکھتا، اگرچہ وہ خشک پتھر اور جمے ہوئے سنگ خارا کے اندر کیوں نہ ہو۔[۱]

۳۵۔ روزی کمانا

محققین کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ علیہم السلام کی طرف سے ایک ہزار روایات محنت کی اہمیت اور اس کی فضیلت کے بارے میں نقل ہوئی ہے ہیں۔ اسلام فقر و تنگدستی کو معاشرے کے لیے مہلک اور انسان کے لیے باعث ذلت قرار دیتا ہے۔

مولا علیؑ نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہ سے فرمایا:

يَا بُنَيَّ! اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكَ الْفَقْرَ، فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنْهُ، فَاِنَّ الْفَقْرَ مَنْقَصَةٌ لِّلدِّيْنِ، مَدْهَشَةٌ لِّلْعَقْلِ، دَاعِيَةٌ لِّلْمَقْتِ۔[۲]

اے فرزند! میں تمہارے لیے فقر و تنگدستی سے ڈرتا ہوں، لہٰذا فقر و ناداری سے اللہ کی پناہ مانگو۔ کیونکہ یہ دین کے نقص، عقل کی پریشانی اور لوگوں کی نفرت کا باعث ہے۔

وَالْحِرْفَةُ مَعَ الْعِفَّةِ خَيْرٌ مِّنَ الْغِنٰى مَعَ الْفُجُوْرِ۔[۳]

---

[۱] محنت کا اسلامی تصور، ص ۶

[۲] نہج البلاغہ، حکمت: ۳۱۹

[۳] نہج البلاغہ مکتوب۔ ۳۱

پاک دامنی کے ساتھ محنت مزدوری کر لینا فسق و فجور میں گھری ہوئی دولت مندی سے بہتر ہے۔

۳۶۔حکومت اور زراعت

محنت و مزدوری سے وابستہ انتہائی اہم شعبہ زراعت ہے۔ زراعت کو فروغ دینا اور اس پر زیادہ توجہ دینا اسلامی حکومت کے اساسی فرائض میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے مصر میں اپنے گورنر کے نام تحریر فرمایا:

وَ لْيَكُنْ نَظَرُكَ فِيْ عِمَارَةِ الْاَرْضِ اَبْلَغَ مِنْ نَظَرِكَ فِي اسْتِجْلَابِ الْخَرَاجِ. لِاَنَّ ذٰلِكَ لَا يُدْرَكُ اِلَّا بِالْعِمَارَةِ. وَ مَنْ طَلَبَ الْخَرَاجَ بِغَيْرِ عِمَارَةٍ اَخْرَبَ الْبِلَادَ. وَ اَهْلَكَ الْعِبَادَ. وَ لَمْ يَسْتَقِمْ اَمْرُهٗ اِلَّا قَلِيْلًا۔[1]

اور خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا، کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، اور جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے، اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔

۲۰۔محنت کشوں اور زراعت پیشہ لوگوں کا خیال

حکومت کا کاشتکاروں کے ساتھ کیسا سلوک ہو؟ اسلامی حکومت زراعت اور زراعت پیشہ لوگوں کو کیا اہمیت دیتی اور ان کا مقام کیا ہے اور ان کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیئے، اس کا اندازہ درج ذیل فرمان سے ہوتا ہے جو حضرت علی مرتضیٰؑ نے مالک اشتر کے نام تحریر فرمایا تھا:

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب: ۵۳

فَإِنْ شَكَوْا ثِقَلًا اَوْ عِلَّةً، اَوِ انْقِطَاعَ شِرْبٍ اَوْ بَالَّةٍ، اَوْ اِحَالَةَ اَرْضٍ اغْتَمَرَهَا غَرَقٌ، اَوْ اَجْحَفَ بِهَا عَطَشٌ، خَفَّفْتَ عَنْهُمْ بِمَا تَرْجُوْ اَنْ يَّصْلُحَ بِهٖ اَمْرُهُمْ، وَ لَا يَثْقُلَنَّ عَلَيْكَ شَيْءٌ خَفَّفْتَ بِهِ الْمَؤُنَةَ عَنْهُمْ، فَاِنَّهٗ ذُخْرٌ يَّعُوْدُوْنَ بِهٖ عَلَيْكَ فِيْ عِمَارَةِ بِلَادِكَ، وَ تَزْيِيْنِ وِلَايَتِكَ، مَعَ اسْتِجْلَابِكَ حُسْنَ ثَنَآئِهِمْ، وَ تَبَجُّحِكَ بِاسْتِفَاضَةِ الْعَدْلِ فِيْهِمْ، مُعْتَمِدًا فَضْلَ قُوَّتِهِمْ بِمَا ذَخَرْتَ عِنْدَهُمْ مِنْ اِجْمَامِكَ لَهُمْ، وَ الثِّقَةَ مِنْهُمْ بِمَا عَوَّدْتَّهُمْ مِنْ عَدْلِكَ عَلَيْهِمْ فِيْ رِفْقِكَ بِهِمْ۔[1]

اب اگر وہ خراج کی گرانباری، یا کسی آفتِ ناگہانی، یا نہری و بارانی علاقوں میں ذرائع آبپاشی کے ختم ہونے، یا زمین کے سیلاب میں گھر جانے، یا سیرابی نہ ہونے کے باعث اس کے تباہ ہونے کی، شکایت کریں تو خراج میں اتنی کمی کردو جس سے تمہیں ان کے حالات کے سُدھرنے کی توقع ہو، اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے سے تمہیں گرانی نہ محسوس ہو، کیونکہ انہیں زیر باری سے بچانا ایک ایسا ذخیرہ ہے کہ جو تمہارے ملک کی آبادی اور تمہارے قلمرو حکومت کی زیب و زینت کی صورت میں تمہیں پلٹا دیں گے، اور اس کے ساتھ تم ان سے خراجِ تحسین اور عدل قائم کرنے کی وجہ سے مسرت بے پایاں بھی حاصل کرسکو گے، اور اپنے اس حسن سلوک کی وجہ سے کہ جس کا ذخیرہ تم نے ان کے پاس رکھ دیا ہے، تم (آڑے وقت پر) ان کی

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب۔ ۵۳

قوت کے بل بوتے پر بھروسا کر سکو گے، اور رحم ورافت کے جلو میں جس سیرتِ عادلانہ کا تم نے انہیں خوگر بنایا ہے اس کے سبب سے تمہیں ان پر وثوق واعتماد ہوسکے گا۔ اس کے بعد ممکن ہے کہ ایسے حالات بھی پیش آئیں کہ جن میں تمہیں ان پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہو تو وہ انہیں بطیب خاطر جھیل لے جائیں گے، کیونکہ ملک آباد ہے تو جیسا بوجھ اس پر لاد دو گے وہ اٹھا لے گا۔ اور زمین کی تباہی تو اس سے آتی ہے کہ کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہو جائیں اور ان کی تنگدستی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ حکام مال و دولت کے سمیٹنے پر تل جاتے ہیں اور انہیں اپنے اقتدار کے ختم ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور عبرتوں سے بہت کم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

۳۷۔ کاشتکاروں کی غربت سے زراعت تباہ ہوتی ہے:

اس کے بعد آپ زراعت کی تباہی کا بنیادی سبب بیان فرماتے ہیں:

وَ اِنَّمَا یُؤْتٰی خَرَابُ الْاَرْضِ مِنْ اِعْوَازِ اَهْلِهَا. وَ اِنَّمَا یُعْوِزُ اَهْلُهَا لِاِشْرَافِ اَنْفُسِ الْوُلَاةِ عَلَی الْجَمْعِ. وَ سُوْٓءِ ظَنِّهِمْ بِالْبَقَآءِ. وَ قِلَّةِ انْتِفَاعِهِمْ بِالْعِبَرِ۔[1]

اور زمین کی تباہی تو اس سے آتی ہے کہ کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہو جائیں اور ان کی تنگدستی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ حکام مال و دولت کے سمیٹنے پر تل جاتے ہیں اور انہیں اپنے اقتدار کے ختم ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور عبرتوں سے بہت کم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب۔ ۵۳

[2] محنت کا اسلامی تصور، ص ۹۰۔ ۹۸

۳۸۔عوام ہنگامی بوجھ اٹھانے کے قابل کب ہوں گے؟

اس کے بعد امامؑ کے فرمان کا ایک حصہ اس بات سے مربوط ہے کہ اگر حکمرانوں کا ہنگامی حالت میں عوام پر بھروسہ کرنا پڑے اوران پر بوجھ ڈالنا پڑے تو یہ کس صورت میں ممکن ہوگا۔آپ فرماتے ہیں:

فَرُبَّمَا حَدَثَ مِنَ الْاُمُوْرِ مَآ اِذَا عَوَّلْتَ فِيْهِ عَلَيْهِمْ مِنْ بَعْدُ، احْتَمَلُوْهُ طِيْبَةَ اَنْفُسِهِمْ بِهٖ، فَاِنَّ الْعُمْرَانَ مُحْتَمِلٌ مَّا حَمَّلْتَهٗ۔[۱]

اس کے بعد ممکن ہے کہ ایسے حالات بھی پیش آئیں کہ جن میں تمہیں ان پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہوتو وہ انہیں بطیب خاطر جھیل لے جائیں گے، کیونکہ ملک آباد ہےتو جیسا بوجھ اس پر لا دو گے وہ اٹھا لے گا۔[۲]

۳۹۔شرم وحیاء کی نعمت

بچہ اگرکسی برے کام کوانجام دینے میں شرم محسوس کرتا ہےتو یہ شرم وحیا بہترین صفت ہےاور یہ انسانی مثبت قدروں میں سے ہےاوراس شرم کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اگروہ اچھے کاموں کے لیےبھی شرم کرتا ہےتو یہ شرم کمزوری ہے۔

مولاعلیؑ فرماتے ہیں:

وَ مَنْ كَثُرَ كَلَامُهٗ كَثُرَ خَطَؤُهٗ، وَ مَنْ كَثُرَ خَطَؤُهٗ قَلَّ

---

[۱] نہج البلاغہ،مکتوب۔۵۳

[۲] محنت کا اسلامی تصور،ص ۹۳

حَيَآؤُهُ، وَ مَنْ قَلَّ حَيَآؤُهُ قَلَّ وَرَعُهُ،وَ مَنْ قَلَّ وَرَعُهُ مَاتَ قَلْبُهُ، وَ مَنْ مَّاتَ قَلْبُهُ دَخَلَ النَّارَ۔[۱]

جو زیادہ بولے گا وہ زیادہ لغزشیں کرے گا، اور جس کی لغزشیں زیادہ ہوں اس کی حیا کم ہو جائے گی، اور جس میں حیا کم ہو اس میں تقویٰ کم ہوگا، اور جس میں تقویٰ کم ہوگا اس کا دل مردہ ہو جائے گا، اور جس کا دل مردہ ہو گیا وہ دوزخ میں جا پڑا۔[۲]

۴۰۔تربیت کا اسلوب

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَمَلُّ كَمَا تَمَلُّ الْاَبْدَانُ، فَابْتَغُوْا لَهَا طَرَآئِفَ الْحِكَمِ۔[۳]

یہ دل بھی اسی طرح اکتا جاتے ہیں جس طرح بدن اکتا جاتے ہیں، لہٰذا (جب ایسا ہو تو) ان کے لیے لطیف حکیمانہ نکات تلاش کرو۔

واضح رہے کہ دینی تربیت اس وقت بچے کو دیں جب بچہ میں پوری طرح آمادگی ہو اور وہ اچھے موڈ میں ہو۔ پس اگر بچے کو جب نیند آ رہی ہو، جب تھکا ہوا ہو یا جب اس کا رجحان کسی کھیل کی طرف ہو تو اس وقت اگر بچے سے دین کی باتیں کریں گے تو نہ صرف اس پر اثر نہ ہوگا بلکہ اس کا ذہن دینی باتوں سے دور ہو جائے گا۔ بچوں میں آمادگی اس وقت آتی ہے جب آپ ان کو کوئی تحفہ دے دیں، کسی پارک میں تفریح کے لیے لے جائیں یا ان کی پسند کی کوئی چیز خرید رہے ہوں اس وقت اگر آپ کوئی مذہبی تعلیم ان کو کر دے دیں گے تو یہ ان

---

[۱] نہج البلاغہ۔حکمت۔۳۴۹

[۲] نہالان اسوہ،ص ۱۹۔۲۰

[۳] نہج البلاغہ۔حکمت۔۹۱

کے دل میں اتر جائے گی۔

جس طرح زندگی میں ہمیشہ ایک جیسی مثبت صورت حال سے دو چار رہنے سے ذہن کام نہیں کرتا۔ اسی طرح ہمیشہ ایک جیسی منفی ہونے کی وجہ سے بھی بچے کا ذہن مسموم اور نا قابل اصلاح ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو تفریح کے لیے لے جانا اور خوبصورت مناظر سے لطف اندوز کرانا نہایت ضروری ہے۔

۴۱۔ استاد کیسا ہو؟

استاد وہ ہے جو اپنی تمام تر توانائی شاگرد کی کامیابی پر خرچ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ شاگرد کی کامیابی کو اپنی کامیابی تصور کرتا ہے۔ اس طرح کہ انسان اپنے حقیقی بھائی سے تو حسد کر سکتا ہے لیکن شاگرد سے حد نہیں کر سکتا بلکہ فخر کرتا ہے۔ شاگرد ایک پھول ہے اور استاد اس پھول کی شائستگی سے دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس پھول کے پھلنے پھولنے کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ اس پر تشدد نہیں کرتا نہ ہی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ مولا علیؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ لِلْقُلُوْبِ شَهْوَةً وَّ اِقْبَالًا وَّ اِدْبَارًا. فَأْتُوْهَا مِنْ قِبَلِ شَهْوَتِهَا وَ اِقْبَالِهَا. فَاِنَّ الْقَلْبَ اِذَا اُكْرِهَ عَمِيَ۔ [1]

دلوں کے لیے رغبت و میلان، آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان سے اس وقت کام لو جب ان میں خواہش و میلان ہو، کیونکہ دل کو مجبور کر کے کسی کام پر لگایا جائے تو اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

دل جبر کی منطق کو نہیں مانتا نہ ہی دل جبر سے صلح کرتا ہے۔ پس جبر اور دل دو متضاد چیزیں ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۱۹۳

۴۲۔ دوستوں سے اثر پذیری

بچے اپنے ہم عمر دوستوں سے ضرور اثر لیتے ہیں، لہذا والدین کو چاہیے کہ نظر رکھیں کہ ان کے بچے کس قسم کے دوستوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھیلتے ہیں۔ بچے چونکہ اپنے کھیل کود میں ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ خوشی سے وقت گزارتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں لہذا اس سے ان میں اثر پذیری کا امکان زیادہ ہوتا۔ ہے۔ ایسے ہم عمر بچوں سے آگاہ رہنا ضروری ہے جو آپ کے بچے کو بری عادتوں میں ڈال دیتے ہیں جیسے نشہ کرنے کی عادت، اس میں خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں والدین کے علم میں نہیں آتیں اور جب علم میں آتی ہیں تو پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ مولا علیؑ کا فرمان ہے:

لَا تَصحَبِ الْمَآئِقَ، فَاِنَّهٗ يُزَيِّنُ لَكَ فِعلَهٗ، وَ يَوَدُّ اَنْ تَكُوْنَ مِثْلَهٗ۔[۱]

بے وقوف کی ہم نشینی اختیار نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارے سامنے اپنے کاموں کو سجا کر پیش کرے گا اور یہ چاہے گا کہ تم اسی کے ایسے ہو جاؤ۔

بے وقوف انسان اپنے طریق کار کو صحیح سمجھتے ہوئے اپنے دوست سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کا سا طور طریقہ اختیار کرے اور جیسا وہ خود ہے ویسا ہی وہ ہو جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا دوست بھی اس جیسا بے وقوف ہو جائے، کیونکہ وہ اپنے کو بے وقوف ہی کب سمجھتا ہے جو یہ چاہے اور اگر سمجھتا ہوتا تو بے وقوف ہی کیوں ہوتا۔ بلکہ اپنے کو عقلمند اور اپنے طریقہ کار کو صحیح سمجھتے ہوئے اپنے دوست کو بھی اپنے ہی ایسا ''عقلمند'' دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی رائے کو سجا کر اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا

---

[۱] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۲۹۳

اس سے خواہش مند ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا دوست اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کی راہ پر چل پڑے۔ اس لیے اس سے الگ تھلگ رہنا ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔[۱]

۴۳۔ سوچ بچار کا فائدہ

خداوند متعال نے انسان کو عقل اور خرد جیسی عظیم دولت سے مالا مال فرمایا اسی لیے اس انسان کو اپنی بہترین اور اشرف مخلوق قرار دیا۔ لہذا وہی انسان بہترین قرار پاتا ہے جو اپنی عقل کا بہترین استعمال کرتا ہے جو ہر قدم سوچ سمجھ کے اٹھاتا ہے اور زندگی کے لیے بہترین راستہ اختیار کرتا ہے اسی حوالے سے مولا علیؑ کا خوبصورت ارشاد ملاحظہ ہو:

وَ مَنْ تَفَكَّرَ اَبْصَرَ۔[۲]

سوچ بچار سے قدم اٹھانے والا (صحیح راستہ) دیکھ لیتا ہے۔[۳]

۴۴۔ اچھے یا برے کام کی پہچان

امور دنیا میں انسان بعض اوقات یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ جو کام وہ کر رہا ہے یا جو پروجیکٹ وہ شروع کر چکا ہے، کیا یہ کام اچھا ہے یا برا؟ خداوند متعال کی نظر میں اس کام کی اہمیت ہے یا نہیں؟ یہ کام مجھے اچھائی کی طرف لے جائے گا یا برائی کی طرف؟ اس کام کا انجام کیا ہوگا اور میرے لیے اس کام میں کیا بہتری ہوگی؟ جب یہ فیصلہ کرنا انسان کے لیے مشکل ہو جائے تو مولا علی علیہ السلام کا خوبصورت فرمان اس کی راہ نمائی کرتا ہے۔

---

[۱] نہالان اسوہ، ص ۳۰۔۱۰۰

[۲] نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱

[۳] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۱۸

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ الْاُمُوْرَ اِذَا اشْتَبَهَتْ اُعْتُبِرَ اٰخِرُهَا بِاَوَّلِهَا۔[۱]

جب کسی کام میں اچھے برے کی پہچان نہ رہے تو آغاز کو دیکھ کر انجام کو پہچان لینا چاہیے۔[۲]

۴۵۔ اپنے آپ سے بے خبر انسان

اِس مصروف دنیا میں انسان جس چیز سے سب سے زیادہ بے خبر ہے وہ اس کی اپنی ذات ہے۔ اتنا مصروف انسان جسے زندگی میں ہر کام کے لیے وقت مل جاتا ہے، اگر وقت نہیں ملتا تو فقط اپنی ذات کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ جو انسان اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے وہ کبھی حق اور سچ کو نہیں پا سکتا۔ مولا علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

هَلَكَ امْرُؤٌ لَّمْ يَعْرِفْ قَدْرَهٗ۔[۳]

جو شخص اپنی قدر و منزلت کو نہیں پہچانتا وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔[۴]

۴۶۔ عقل کا سلامت نہ رہنا

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَكْثَرُ مَصَارِعِ الْعُقُوْلِ تَحْتَ بُرُوْقِ الْمَطَامِعِ۔[۵]

---

[۱] نہج البلاغہ۔ حکمت ۷۶

[۲] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۲۰

[۳] نہج البلاغہ۔ حکمت ۱۴۹

[۴] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۲۲

[۵] نہج البلاغہ۔ حکمت ۲۱۹

اکثر عقلوں کا ٹھوکر کھا کر گرنا طمع وحرص کی بجلیاں چمکنے پر ہوتا ہے۔

جب انسان طمع وحرص میں پڑ جاتا ہے تو رشوت، چوری، خیانت، سودخواری اور اس قبیل کے دوسرے اخلاقی عیوب اس میں پیدا ہو جاتے ہیں اور عقل ان باطل خواہشوں کی جگمگاہٹ سے اس طرح خیرہ ہو جاتی ہے کہ اسے ان قبیح افعال کے عواقب ونتائج نظر ہی نہیں آتے کہ وہ اسے روکے ٹوکے اور اس خواب غفلت سے جھنجھوڑے۔ البتہ جب دنیا سے رخت سفر باندھنے پر تیار ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو کچھ سمیٹا تھا وہ یہیں کے لیے تھا، ساتھ نہیں لے جا سکتا، تو اس وقت اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔[۱]

۴۷۔ طمع ولالچ

کسی چیز میں حد درجہ دلچسپی کی وجہ سے نفس کا اس کی جانب راغب ہونا طمع یعنی لالچ کہلاتا ہے۔ مال ودولت کی ایسی طمع جس کا کوئی دینی فائدہ نہ ہو، یا ایسی اچھی نیت نہ ہو جو لالچ ختم کر دے، نہایت ہی قبیح، گناہوں کی طرف رغبت دلانے والی اور ہلاکت میں ڈالنے والی بیماری ہے، مال ودولت کے لالچ میں پھنسنے والا شخص ناکام ونامراد اور جو اِن کے مکروہ جال سے بچ گیا وہی کامیاب وکامران ہے۔ طویل اور لمبی لمبی آرزوئیں انسانی سعادت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، سب سے بڑا دشمن ہے۔ مولا علیؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ الطَّمَعَ مُوْرِدٌ غَیْرُ مُصْدِرٍ. وَ ضَامِنٌ غَیْرُ وَفِیٍّ. وَ رُبَّمَا شَرِقَ شَارِبُ الْمَآءِ قَبْلَ رِیِّہٖ. وَ کُلَّمَا عَظُمَ قَدْرُ الشَّیْءِ الْمُتَنَافَسِ فِیْہِ عَظُمَتِ الرَّزِیَّۃُ لِفَقْدِہٖ. وَ الْاَمَانِیُّ تُعْمِیَ

---

[۱] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۲۳

اَعْيُنَ الْبَصَآئِرِ، وَ الْحَظُّ يَأْتِیْ مَنْ لَّا يَأْتِيْهِ۔[1]

طمع گھاٹ پر اتارتی ہے مگر سیراب کئے بغیر پلٹا دیتی ہے، ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتی ہے مگر اسے پورا نہیں کرتی۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پانی پینے والے کو پینے سے پہلے ہی اچھو ہو جاتا ہے اور جتنی کسی مرغوب و پسندیدہ چیز کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی اسے کھو دینے کا رنج زیادہ ہوتا ہے۔ آرزوئیں دیدۂ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہیں اور جو نصیب میں ہوتا ہے پہنچنے کی کوشش کئے بغیر مل جاتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

اِذَا كَانَ الطَّمَعُ هَلَاكًا، لَيْسَ كُلُّ عَوْرَةٍ تَظْهَرُ، وَ لَا كُلُّ فُرْصَةٍ تُصَابُ، وَ رُبَّمَآ اَخْطَاَ الْبَصِيْرُ قَصْدَهٗ، وَ اَصَابَ الْاَعْمٰى رُشْدَهٗ۔[2]

جب حرص و طمع تباہی کا سبب ہو تو مایوسی ہی میں کامرانی ہے، ہر عیب ظاہر نہیں ہوا کرتا، فرصت کا موقع بار بار نہیں ملا کرتا، کبھی آنکھوں والا صحیح راہ کھو دیتا ہے اور اندھا صحیح راستہ پا لیتا ہے۔[3]

۴۸۔ مشورہ کی اہمیت

مشورہ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پیغمبر اکرم وحی آسمانی سے قطع نظر ایسی قوت فکر کے مالک تھے کہ انہیں کسی قسم کے مشورہ کی ضرورت نہ تھی، پھر بھی آپ مسلمانوں کو

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت ۲۷۵

[2] نہج البلاغہ۔ مکتوب۔ ۳۱

[3] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۲۴

مشورہ کی اہمیت بتلانے کے لیے قانون سازی کو چھوڑ کر دیگر عام معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے تا کہ ان کی قوت فکر و نظر پروان چڑھ سکے اور خصوصیت کے ساتھ صاحب الرائے افراد کی قدر افزائی کیا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض دفعہ ان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اصولی طور پر جو لوگ اپنے اہم کاموں کو ایک دوسرے کے صلاح مشورہ سے انجام دیتے اور متعلقہ امور کے ماہر غور و خوض کے بعد ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں اس کے برعکس جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے صلاح مشورہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں وہ کتنے ہی بڑے صاحب فکر و نظر کیوں نہ ہوں زیدہ تر خطرناک اور المناک اشتباہات میں گرفتار ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں مشورہ سے بے نیازی کی وجہ سے عامۃ الناس میں شخصیت کا وقار ختم ہو جاتا ہے اور افکار و نظریات کی ترویج میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے اور موجود استعدادیں ختم ہو جاتی ہیں اور اس طرح کسی ملت کا بہت بڑا انسانی سرمایہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مزید برآں جو شخص اپنے کام دوسروں کی صلاح مشورہ سے کرتا ہے اگر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے تو دوسرے لوگ اس کو حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ دوسرے لوگ اس کی کامیابی کو اپنی طرف سے ہی سمجھتے ہیں اور عموماً انسان اس کام سے حسد نہیں کرتا جسے اس نے خود انجام دیا ہو اور اگر وہ کبھی شکست کھا جائے تو وہ دوسروں کے اعتراضات کا نشانہ نہیں بنتا کیونکہ کوئی شخص اپنے کام کے نتیجہ پر اعتراض نہیں کرتا نہ صرف یہ کہ اعتراض نہیں کرتا بلکہ ہمدردی اور غمخواری بھی کرتا ہے۔

مشورہ کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان دوسرے افراد کی شخصیت کی قدر و قیمت اور ان کی دشمنی اور دوستی کا اندازہ بھی لگالیتا ہے اور یہ چیز کامیابی کے لیے در کنار شناسائی کا بھی سبب بنتی ہے۔ اسلامی روایات میں مشورہ کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

مولا علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنِ اسْتَبَدَّ بِرَأْيِهِ هَلَكَ، وَ مَنْ شَاوَرَ الرِّجَالَ شَارَكَهَا فِيْ عُقُوْلِهَا۔[1]

جو خود رائی سے کام لے گا وہ تباہ و برباد ہوگا، اور جو دوسروں سے مشورہ لے گا وہ ان کی عقلوں میں شریک ہوجائے گا۔

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَا غِنٰى كَالْعَقْلِ، وَ لَا فَقْرَ كَالْجَهْلِ، وَ لَا مِيْرَاثَ كَالْأَدَبِ، وَ لَا ظَهِيْرَ كَالْمُشَاوَرَةِ۔[2]

عقل سے بڑھ کر کوئی ثروت نہیں اور جہالت سے بڑھ کر کوئی بے مائیگی نہیں۔ ادب سے بڑھ کر کوئی میراث نہیں اور مشورہ سے زیادہ کوئی چیز معین و مددگار نہیں۔[3]

۴۹۔ رسک لینا، بے خطر رہنا (Risk Management)

اگر دیکھا جائے تو انسانی زندگی خطرات اور مشکلات سے عبارت ہے۔ کامیاب انسان وہی ہوتے ہیں جو خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ایک بہادر نڈر انسان ہونے کے ناطے تمام مشکلات کو عبور کرتے ہیں اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں گھبراتے نہیں بلکہ رسک لیتے ہیں اور نڈر ہو کر جیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِذَا هِبْتَ اَمْرًا فَقَعْ فِيْهِ، فَاِنَّ شِدَّةَ تَوَقِّيْهِ اَعْظَمُ مِمَّا

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت ۱۶۱

[2] نہج البلاغہ۔ حکمت ۵۴

[3] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۲۸

تَخَافُ مِنْهُ۔[1]

جب کسی امر سے دہشت محسوس کرو تو اس میں پھاند پڑو، اس لیے کہ کھٹکا لگا رہنا اس ضرر سے کہ جس کا خوف ہے، زیادہ تکلیف دہ چیز ہے۔[2]

۵۰۔ خود پسندی

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَلْاِعْجَابُ يَمْنَعُ مِنَ الْاِزْدِيَادِ۔[3]

خود پسندی ترقی سے مانع ہوتی ہے۔

جو شخص جویائے کمال ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ابھی وہ کمال سے عاری ہے، اس سے منزل کمال پر فائز ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن جو شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ تمام وکمال ترقی کے مدارج طے کر چکا ہے وہ حصول کمال کے لیے سعی وطلب کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ بزعم خود کمال کی تمام منزلیں ختم کر چکا ہے اب اسے کوئی منزل نظر ہی نہیں آتی کہ اس کے لیے تگ ودو کرے چنانچہ یہ خود پسند و برخود غلط انسان ہمیشہ کمال سے محروم ہی رہے گا اور یہ خود پسندی اس کے لیے ترقی کی راہیں مسدود کردے گی۔[4]

۵۱۔ تقویٰ اور نظم وضبط

خدائے عالم وقادر نے اپنی پوری کائنات میں محیر العقول نظم کو جاری وساری فرمایا ہے اور اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بنی نوع انسان بھی اپنی نجی اور معاشرتی زندگی میں نظم وضبط

---

[1] نہج البلاغہ۔ حکمت ۱۷۵

[2] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۳۱

[3] نہج البلاغہ۔ حکمت ۱۶۷

[4] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۳۴

پیدا کریں۔ اس نے آسمانی مذاہب کے ذریعے خصوصاً دین اسلام کے ذریعہ نظم وضبط کی اہمیت بیان فرمائی ہے اور اس کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ تقویٰ، قلب وروح، شعور و آگہی، عزم و ارادے، ضبط و نظم اور عمل و کردار کی اس قوّت اور استعداد کا نام ہے۔ تکامل انسانی کے لیے تقوی اور نظم وضبط اس قدر ضروری امور ہیں کہ مولائے متقیانؑ نے وصیت فرمائی:

اُوصِیکُمَا وَ جَمِیْعَ وَلَدِیْ وَ اَهْلِیْ وَ مَنْ بَلَغَهٗ کِتَابِیْ، بِتَقْوَی اللهِ وَ نَظْمِ اَمْرِکُم وَ صَلَاحِ ذَاتِ بَیْنِکُمْ۔۔۔[1]

میں تم کو، اپنی تمام اولاد کو، اپنے کنبہ کو اور جن جن تک میرا یہ نوشتہ پہنچے سب کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا، اپنے معاملات درست اور آپس کے تعلقات سلجھائے رکھنا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

لَا مَالَ اَعْوَدُ مِنَ الْعَقْلِ، وَ لَا وَحْدَةَ اَوْحَشُ مِنَ الْعُجْبِ، وَ لَا عَقْلَ کَالتَّدْبِیْرِ، وَ لَا کَرَمَ کَالتَّقْوٰی، وَ لَا قَرِیْنَ کَحُسْنِ الْخُلْقِ، وَ لَا مِیرَاثَ کَالْاَدَبِ، وَ لَا قَآئِدَ کَالتَّوْفِیْقِ، وَ لَا تِجَارَةَ کَالْعَمَلِ الصَّالِحِ، وَ لَا رِبْحَ کَالثَّوَابِ، وَ لَا وَرَعَ کَالْوُقُوْفِ عِنْدَ الشُّبْهَةِ، وَ لَا زُهْدَ کَالزُّهْدِ فِی الْحَرَامِ، و لَا عِلْمَ کَالتَّفَکُّرِ، وَ لَا عِبَادَةَ کَاَدَاءِ الْفَرَآئِضِ، وَ لَآ اِیْمَانَ کَالْحَیَآءِ وَ الصَّبْرِ، وَ لَا حَسَبَ کَالتَّوَاضُعِ، وَ لَا شَرَفَ کَالْعِلْمِ، وَ لَا عِزَّ کَالْحِلْمِ، وَ لَا مُظَاهَرَةَ اَوْثَقُ مِنَ الْمُشَاوَرَةِ۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ۔ مکتوب، ۴۷

[2] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۱۱۳

عقل سے بڑھ کر کوئی مال سود مند اور خود بینی سے بڑھ کر کوئی تنہائی
وحشت ناک نہیں، اور تدبیر سے بڑھ کر کوئی عقل کی بات نہیں، اور
کوئی بزرگی تقویٰ کے مثل نہیں، اور خوش خلقی سے بہتر کوئی ساتھی اور
ادب کے مانند کوئی میراث نہیں، اور توفیق کے مانند کوئی پیشرو اور
اعمال خیر سے بڑھ کر کوئی تجارت نہیں، اور ثواب کا ایسا کوئی نفع نہیں،
اور کوئی پرہیز گاری شبہات میں توقف سے بڑھ کر نہیں، اور حرام کی
طرف بے رغبتی سے بڑھ کر کوئی زہد اور تفکر و پیش بینی سے بڑھ کر کوئی
علم نہیں، اور ادائے فرائض کے مانند کوئی عبادت اور حیاء و صبر سے
بڑھ کر کوئی ایمان نہیں، اور فروتنی سے بڑھ کر کوئی سرفرازی اور علم کے
مانند کوئی بزرگی و شرافت نہیں، حلم کے مانند کوئی عزت اور مشورہ سے
مضبوط کوئی پشت پناہ نہیں۔[1]

۵۲۔جلد بازی

کسی چیز کو زیادہ پسند کرنا، سطحی اور محدود فکر، خواہشات کا انسان پر غلبہ اور کسی چیز کے بارے میں حد سے زیادہ اچھا گمان۔ یہ سب جلد بازی کے عوامل ہیں۔ عام طور پر سطحی مطالعہ اور ابتدائی آگاہی کسی امر کی حقیقت اور اس کے نفع و نقصان کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہوتے لہٰذا عموماً جلد بازی ندامت، نقصان اور پشیمانی کا موجب بنتی ہے۔ مولا علیؑ فرماتے ہیں:

وَمُجْتَنِی الثَّمَرَةِ لِغَيْرِ وَقْتِ اِيْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ بِغَيْرِ اَرْضِهٖ۔[2]

پھلوں کو ان کے پکنے سے پہلے چننے والا ایسا ہے جیسے دوسروں کی

---

[1] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۳۷

[2] نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۵

زمین میں کاشت کرنے والا۔[۱]

۵۳۔ بامروت لوگ

بامروت ہونا ایک اہم اور بہترین صفت کمال انسانی ہے جو انسان کی شخصیت کو مضبوط بناتی ہے اور اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ بہتر ترتیب دینے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ خداوندمتعال بھی بامروت لوگوں کو ہی پسند کرتا ہے۔ مولا علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

اَقِیْلُوْا ذَوِی الْمُرُوْءَاتِ عَثَرَاتِهِمْ، فَمَا یَعْثُرُ مِنْهُمْ عَاثِرٌ اِلَّا وَ یَدُ اللهِ بِیَدِهٖ یَرْفَعُهٗ۔[۲]

بامروت لوگوں کی لغزشوں سے درگزر کرو۔ (کیونکہ) ان میں سے جو بھی لغزش کھا کر گرتا ہے تو اللہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھالیتا ہے۔[۳]

۵۴۔ لڑائی جھگڑا

لڑائی جھگڑے کا سب سے بڑا نقصان انسان کی عزت اور آبرو کا پائمال ہو جانا ہے۔ مولا علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ ضَنَّ بِعِرْضِهٖ فَلْيَدَعِ الْمِرَآءَ۔[۴]

جسے اپنی آبرو عزیز ہو وہ لڑائی جھگڑے سے کنارہ کش رہے۔[۵]

---

[۱] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۴۱

[۲] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۱۹

[۳] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۵۱

[۴] نہج البلاغہ۔ حکمت۔ ۳۶۲

[۵] راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، ص ۵۶

اِختتامیہ

مظلومِ تاریخ

ا۔مولا علی علیہ السلام کی مظلومیت

سب سے زیادہ مظلوم امام علی علیہ السلام ہیں۔مولاؑ فقط اپنے زمانے میں ہی مظلوم نہیں بلکہ آج کے زمانے میں بھی مظلوم ہیں۔نظر انداز ہیں۔علی علیہ السلام کو پہچانا نہیں گیا۔علی علیہ السلام کی معرفت کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ہائے ستم کہ زمانے کو علی علیہ السلام کی معرفت نہیں ہے۔اس لیے مولاؑ اپنے چاہنے والوں اور اپنے نا چاہنے والوں دونوں کی طرف سے مظلوم تاریخ ہیں۔ چاہنے والوں نے بھی حد سے تجاوز کر کے مولاؑ پر ظلم کیا اور نہ چاہنے والوں نے بھی آپ سے روگردانی کر کے۔شیعہ سنی متفقہ تاریخ کے مطابق ، یہ مظلومِ تاریخ علیؑ چھ سال کی عمر سے لے کرتا آخرین حیات رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے ساتھ رہے اور دن میں دو مرتبہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درس لیا کرتے تھے۔ایک بار فجر سے پہلے سحر کے وقت اور ایک رات کی خلوت کے وقت درس لیا کرتے تھے۔لیکن ہم نے اس علیؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ہم جو مولاؑ کو بہت زیادہ چاہتے ہیں اور محبت کا دم بھرتے ہیں، ہم نے کیا کیا مولاؑ کے لیے؟ حد سے بڑھا کر غلو کیا۔اور دوسرے لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ زیادتی کی یہاں تک کہ مولاؑ سے احادیث ہی نہیں لیں۔علیؑ سے احادیث نہیں لیں جس نے پوری زندگی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گزاری، سب سے زیادہ علم حاصل کیا اس سے صرف 500 احادیث کو لیا۔صرف پانچ سو! کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔اس بات کو فرقہ واریت کے تناظر میں نہ لیا جائے بلکہ یہ حقائق ہیں۔حال ہی میں مولانا ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے تحقیق پیش کی ہے کہ 15 ہزار 200 احادیث امام علی علیہ السلام سے سنی مصادر کتب میں منقول ہیں۔

لیکن افسوس! کہ ان پندرہ ہزار دو سو احادیث میں سے رائج فقط پانچ سو ہیں۔[1]

اسی لیے مولاؑ کی ایک حدیث ہے۔ صحیح بخاری میں کتاب المغازی میں اور دیگر کتابوں میں ہے ہمارے ہاں اصول کافی میں ہے۔ نہایت قابل توجہ حدیث، قابل تحقیق حدیث، وہ حدیث یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَنَا اَوَّلُ مَنْ یَجْثُوا بَیْنَ یَدَیِ الرَّحْمٰنِ لِلْخُصُوْمَةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔

قیامت کے دن سب سے پہلے اللہ کے سامنے مقدمہ پیش کرنے والا میں ہوں گا، روز قیامت سب سے پہلے میں اللہ کے سامنے میں اپنا مقدمہ پیش کروں گا۔

سب سے پہلے علی علیہ السلام اللہ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کریں گے سب سے پہلے، اس لیے کہ علی علیہ السلام اول مظلوم ہے ہم تو کہتے نا سید الشہداء مظلوم ہے سید الشہداء کا نمبر بعد میں آتا ہے سب سے پہلے علی علیہ السلام کا نمبر آتا ہے، مظلومیت میں۔ علی علیہ السلام سب سے پہلا مظلوم ہے سب سے پہلا مظلوم رسالت مآب کے بعد۔ آپ جب یہ بات کرتے ہیں تو دوسرے لوگ کہتے ہیں کیا ظلم ہوا ہے علیؑ کے ساتھ؟ علی علیہ السلام نے مدینہ میں دوسروں کے ساتھ زندگی گزاری آرام سے تو کیا ظلم ہوا ہے؟ بہر حال علی علیہ السلام کے گھر پہ جو ظلم ہوا علی علیہ السلام کے ساتھ جو ظلم ہوا علی علیہ السلام کو جو گوشہ نشینی میں بیٹھنا پڑا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ علی علیہ السلام سرگوشی کرتے تھے۔ وہ علیؑ جو ہر لحظہ رسالت مآب کے پہلو بہ پہلو ہوتے تھے آج کہیں نظر نہیں آتے۔ وہ علی علیہ السلام جو ہمیشہ رسول اللہ کے ساتھ ان کے سامنے سامنے ہوتے تھے آج نظر نہیں آتے۔ کیا ہو گیا مسلمانوں کو؟ کیا تاریخ کا اس سے بڑا ظلم بھی ہو سکتا ہے؟ علی علیہ السلام وہی

---

[1] دروس: تفسیر قرآن سورہ الزمر آیات ۲۷-۳۱

علی علیہ السلام ہے، مسلمان وہی مسلمان ہیں، معاشرہ وہی معاشرہ ہے لیکن اس میں علی علیہ السلام غائب کیسے ہوا؟ لیے اس کسم پرسی واویلا کیوں نہیں کرتا؟ ہائے مظلومیت علیؑ۔۔۔

۲۔ مظلومیتِ نہج البلاغہ

علی علیہ السلام کی ذات کی طرح آپ کا کلام بھی مظلوم ہے چونکہ مولاؑ کے کلام کو یا تو سمجھا نہیں گیا یا مولاؑ کے کلام تک پہنچا ہی نہیں گیا۔ نہ چاہنے والوں نے تو مولاؑ سے احادیث ہی نہیں لی اور چاہنے والوں کو یہ وقت ہی نہیں ملا کہ وہ مولاؑ کے کلام کو پڑھ سکیں۔ جب علی علیہ السلام کو نہیں پہچانا ایک معلم کو نہیں پہچانا تو اس کے کلام "نہج البلاغہ" کو بھی نہیں پہچانا اور اس کلام کی بھی خدمت نہیں ہوئی۔ جبکہ ہمارے سامنے علیؑ کا کلام "نہج البلاغہ" ایک معجزہ ہے۔ ایک ایسا کلام کہ جو "فوق البشر" کلام یعنی تمام انسانوں کے کلام سے بہترین کلام ہے۔

ہم اس کوتاہی کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے مولاؑ سے معذرت چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے کلام کی خدمت نہیں کر سکے۔

کتنے دکھ کا مقام ہے کہ ہم شیعانِ حیدر کرارؑ ہوتے ہوئے بھی نہج البلاغہ نہیں پڑھتے۔ نہج البلاغہ کے قریب نہیں جاتے۔ آخر کیوں جائیں؟ کیونکہ یہ کلام تو ہمارے مزاجوں کے قریب نہیں۔ چونکہ ہم تو آسانیاں چاہتے ہیں، ہم تو مادر پدر آزاد رہنا چاہتے ہیں اور نہج البلاغہ میں تو تقویٰ الٰہی کا ذکر ہے۔ یہ تو عبادت سکھاتی ہے یہ تو بندگی سکھاتی ہے۔ یہ تو خالق کے سامنے جھکنا سکھاتی ہے اسی لیے ہم جس طرح قرآن کو اہمیت نہیں دیتے اسی طرح نہج البلاغہ کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔ دکھ کا مقام ہے کہ ہم کس قدر غافل ہیں!

۳۔ نصیحت

علی علیہ السلام کے ہمارے اوپر بہت احسان ہیں۔ علی علیہ السلام ہمیں کہاں کام نہیں آئیں گے۔ قیامت کے دن، دنیا میں، آخرت میں، ہر مقام پر، جب علی علیہ السلام کے بغیر گزارا نہیں تو پھر کلامِ

علی علیہ السلام کے بغیر بھی گزارا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں نہج البلاغہ کی خدمت کرنی ہوگی اور یہ سمجھنا ہوگا کہ علی علیہ السلام ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ علیؑ ہمیں کیا بتانا چاہتے ہیں؟ علی علیہ السلام ہم سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ علی علیہ السلام ہمیں کیسا انسان بنانا چاہتے ہیں؟ علیؑ ہم سے کیسے خوش ہوں گے اور ہم علیؑ کو کیسے خوش کر سکتے ہیں؟ یہ وہ بنیادی ترجیحات ہیں جو ہماری زندگی کا حصہ ہونی چاہئیں اور انہی ترجیات میں ہمیں اپنی جان، جانِ آفرینش کے سپرد کرنی چاہیے! (انشاء اللہ)[1]

منابع و مآخذ

1. محسن علی نجفی، بلاغ القران، لاہور: ادارہ نشر معارف اسلامی، رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۸۔
2. محسن علی نجفی، الکوثر فی تفسیر القران، لاہور: معراج دین پرنٹرز، ربیع الاول ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴۔
3. محسن علی نجفی، آئین بندگی، لاہور: معراج کمپنی، محرم الحرام ۱۴۳۷ھ/ 2015۔
4. محسن علی نجفی، محنت کا اسلامی تصور، راولپنڈی: اسد محمود پرنٹنگ پریس، محرم الحرام ۱۴۰۷ھ۔
5. محسن علی نجفی، فلسفہ نماز، لاہور: معراج کمپنی، رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۱۷۔
6. محسن علی نجفی، دراسات عصریۃ فی الٰہیات، راولپنڈی: اسد محمود پرنٹنگ پریس، جمادی الثانی ۱۴۴۳ھ۔
7. محسن علی نجفی، انسان اور کائنات میں اللہ کی تجلی، راولپنڈی: اسد محمود پرنٹنگ پریس، جمادی الاول ۱۴۳۹ھ/ ۲۰۱۷۔
8. محسن علی نجفی، راہنما اصول برائے تنظیمی انقلاب، راولپنڈی: اسد محمود پرنٹنگ پریس، ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶۔
9. محسن علی نجفی، دعا قرآن وسنت کی روشنی میں، اسلام آباد: البلاغ المبین۔ اسلامی تحقیقاتی واشاعتی ادارہ، شوال ۱۴۲۹ھ۔
10. محسن علی نجفی، دروس وتقریرات، https//:youtu.be/RXcObYWHDKQ?si=XxSXUqNCltOVwXpM
11. محسن علی نجفی، نہالان اسوہ۔

---

[1] دروس شیخ الجامعہ، ویڈیو لنک: https//:youtu.be/RXcObYWHDKQ?si=XxSXUqNCltOVwXpM

اَلعُلَماءُ باقونَ ما بَقِيَ الدَّهرُ

علماء رہتی دُنیا تک باقی رہتے ہیں۔ (نہج البلاغہ)

باب مدینۃ العلم، امیر کلام، صاحب نہج البلاغہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بیان سے جو مربوط و منسلک ہوگیا وہ سید رضیؒ کی طرح ہزار سال بعد بھی زندہ اور ہر گھر موجود ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی ذات اور آپؑ کے بیانات بالخصوص "نہج البلاغہ" سے "محسن ملت" کی محبت آپ کی تحریروں سے واضح وعیاں ہے۔ قرآن کی تفسیر ہو، عقائد کے مسائل ہوں، آئین بندگی ہو، اصول تنظیم و زندگی ہوں، دُعا ہو یا نماز کا فلسفہ جس موضوع پر آپ نے قلم اُٹھایا وہیں "نہج البلاغہ" کے کلمات روشن ستارے کی طرح تحریر کی زینت بنے۔

مرکز افکار اسلامی کی نہج البلاغہ کی خدمات پر فوق العادہ اظہار مسرت اور ادارے کی حوصلہ افزائی آپ کی تقاریر میں آشکارا ہے۔

پروردگار محسن ملت کو اپنے محبوب اور مظلوم امام علیہ السلام کے جوار میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کا چھوڑا ہوا چمن ہمیشہ آباد اور پھلتا پھولتا رہے۔